تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اُردو

تانیثیت کے تناظر میں اقبال کا تصور عورت

محقق:

حفصہ فخر

227-FLL/MSURDU/F17

نگران:

ڈاکٹر سائرہ بتول

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

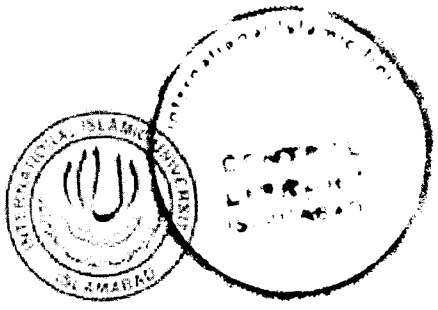

شعبۂ اردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

Accession No. IH 24737
MS
891.439
ح ف ت

ردو ادب — تصور عورت

اقبال، علامہ محمد -

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **HAFSA FAKHAR**

Title of the Thesis: تانیثیت کے تناظر میں اقبال کا تصور عورت

Registration No: **227-FLL/MSURD/F17**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Humaira Ishfaq
Chairperson,
Department of Urdu, Female, IIUI

External Examiner:

Dr. Sobia Saleem
Assistant Professor
National University of Modern Languages
Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Sabahat Mushtaq
Lecturer
Department Of Urdu, IIUI

Supervisor:

Dr. Saira Batool
Assistant Professor
Department Of Urdu, IIUI

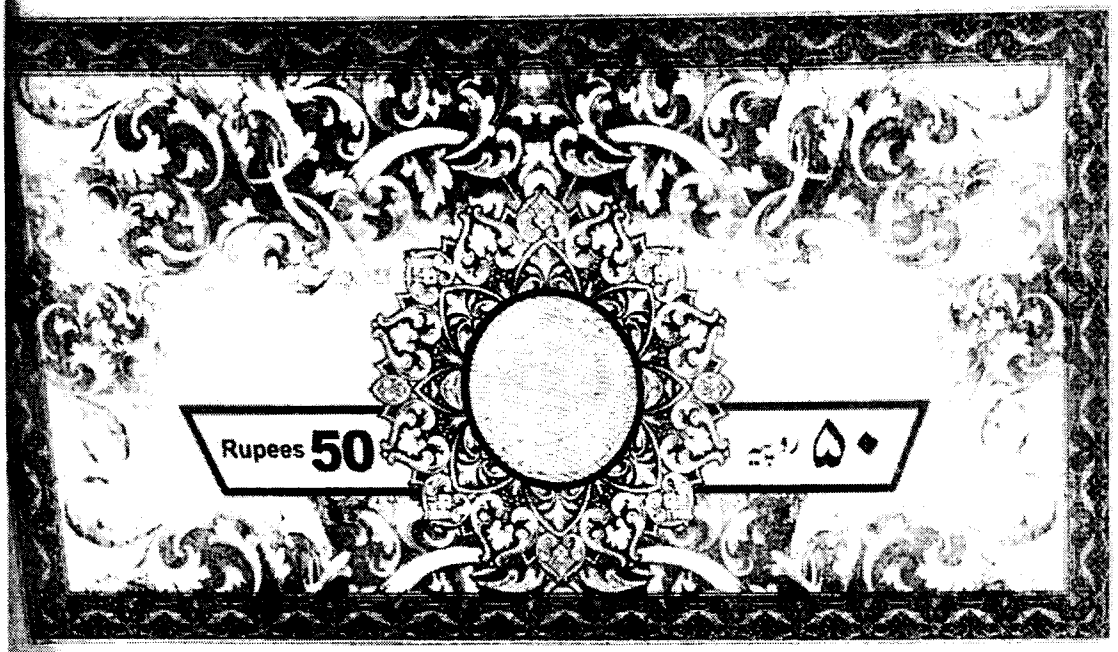

A199591

Rupees 50 ۵۰ روپیہ

بیان حلفی

میں مسماۃ، حفصہ فخر دختر فخر اقبال سکنہ محلہ کسانہ اقبال ہاؤس کوٹلہ ارب علی خان، ڈاکخانہ خاص، تحصیل کھاریاں، ضلع گجرات۔
شناختی کارڈ نمبر 34202-4349627-2 حلفیہ بیان کرتی ہوں۔
کہ میرا مقالہ بعنوان تانیثیت کے تناظر میں اقبال کا تصور عورت سرقے سے پاک ہے۔ اس مقالے میں مکمل اور اصل حوالہ جات دیے گئے ہیں۔ اور میں نے یہ کام اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو ڈاکٹر سائرہ بتول کی زیر نگرانی مکمل کیا ہے۔
میں حلفیہ بیان دیتی ہوں کہ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ ہی آئندہ کروں گی۔ مندرجہ بالا بیان میں جو بھی کچھ کہا گیا ہے۔ میرے علم و یقین کے مطابق بالکل درست ہے اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔

المحلف

حفصہ فخر دختر فخر اقبال دستخط ------------------- نشان انگوٹھا ------------------------------

شناختی کارڈ نمبر 34202-4349627-2

گواہ: نام Ziqafakhan --------------------

شناختی کارڈ نمبر 34202-8021082-----

ATTESTED

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبہ اُردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ حفصہ فخر رجسٹریشن نمبر 227-FLL/MSURDU/F17 نے ایم۔ایس۔اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان **"تانیثیت کے تناظر میں اقبال کا تصور عورت"** میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر سائرہ بتول

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

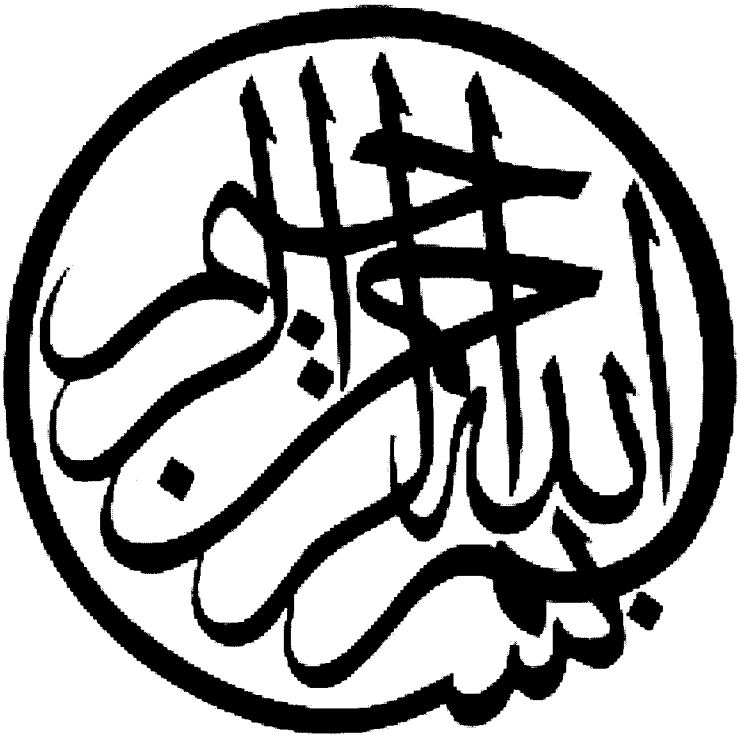
بسم الله الرحمن الرحيم

پیش لفظ

ہماری انفرادی یا اجتماعی زندگی کا کوئی شعبہ اور کوئی اہم پہلو ایسا نہیں جس سے متعلق شاعر مشرق مفکر اسلام علامہ محمد اقبال نے کوئی حیات آفریں پیغام نہ دیا ہو۔ انسانی زندگی سے متعلق جتنے اہم مسائل ہیں، ان پر اقبال نے قرآن وسنت کی روشنی میں حکمت و بصیرت کے موتی ہمارے سامنے پیش کیے۔ اقبال کے کلام کی اساس قرآنی تعلیمات پر مبنی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے اشعار قرآنی آیات کا براہِ راست ترجمہ کر رہے ہوں۔ اقبال کا پیغام اپنی ہمہ گیری اور وسعت کے اعتبار سے آفاقیت کا حامل ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا پیغام کسی خاص شخص، قوم یا ملک کے لیے نہیں ہے بلکہ تمام عالم انسانیت کی بھلائی اور تعمیر و ترقی کے لیے ہے۔

کلامِ اقبال کا مطالعہ عموماً ایک عظیم شاعر اور فلسفی کے طور پر کیا جاتا ہے۔ اقبال کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کی وہ جدوجہد ہے جو انہوں نے مذہبی و سماجی اصلاح کے لیے کی۔ اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں پر فکر کے نئے نئے در وا کیے اور مذہبی و سماجی حوالے سے ان کی رہنمائی کی۔ علامہ اقبال نے جہاں سیاسی، معاشرتی، اخلاقی اور اقتصادی مسائل سے متعلق اپنی شاعری میں مخصوص نظریات پیش کیے ہیں وہاں تعلیم نسواں، حقوق نسواں اور آزادئ نسواں سے متعلق بھی اپنا ایک الگ اور منفرد تصور پیش کیا۔ اقبال کا تصور زن دین و دنیا کی یکجائی اور جدید و قدیم تصورات کے اشتراک کا ایک حسین امتزاج ہے۔

زیرِ مطالعہ تحقیقی مقالے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ جو ناقدین اقبال پر الزام لگاتے ہیں کہ اقبال تعلیم نسواں کے حق میں نہ تھے بلکہ وہ ایک ایسی عورت کا تصور پیش کرتے ہیں جس کا فرض صرف امومت کے فرائض انجام دینا ہے اور گھر کی چار دیواری میں رہ کر اولاد کی بہتر تربیت کرنا ہے۔ در حقیقت یہ الزام درست نہیں بلکہ اقبال کے ساتھ ناانصافی ہے کہ ان کی شاعری یا ان کے وہ افکار و نظریات جن سے ناقدین یا تفہیم کرنے والوں کو اتفاق نہ ہو، ان کو بالکل ردّ کر دیں یا پھر انہیں اپنی پسند کے مطابق ڈھالنے کے لیے غلط تاویلیں اور دلیلیں پیش کریں۔ اس تحقیقی مقالے کے ذریعے اقبال کے اشعار و افکار کی روشنی میں عورت کے تصور کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیمِ نسواں، حقوق نسواں اور آزادی نسواں کا مفہوم نظریات اقبال کے عین مطابق واضح کیا گیا ہے، اقبال کے تصور عورت کی تفہیم کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور مشرق و مغرب کے تصور عورت میں جو فرق و اختلاف ہے اسے واضح کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

اگرچہ اقبال کے تصور عورت کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اقبال کی فکر کے مطابق مشرقی عورت کے تصور کو تانیثیت کے تناظر میں موضوع بحث بنایا جائے۔ لہٰذا اسی فکر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے زیرِ مطالعہ تحقیقی مقالہ چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

باب اوّل: تانیثیت: فکری مباحث پر مشتمل ہے۔اس باب کے (حصہ الف) میں تانیثیت کے آغاز وارتقا اور سبب وجود پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ کن کن مسائل اور وجوہات کی بناپر تانیثی تحریک شروع ہوئی اور کس طرح یہ پوری دنیامیں پھیلتی گئی۔ کس طرح مغربی مصنفین و مفکرین نے اس تحریک کے اثرات کو قبول کیااور اپنے افکار کے ذریعے لوگوں تک اس کا مقصد پہنچایا۔ پہلا باب تانیثی فکریات اور اس کے عوامل پر بحث کرتا ہے۔

ب: اردو ادب میں تانیثیت کی روایت اور اس کے اثرات ہے۔اس میں اردو ادب کی ان نثر نگار خواتین اور چند شاعرات کا ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے صنفی انصاف کی طرف توجہ دلائی اور تعلیمی، معاشرتی، اقتصادی اور معاشی سطح پر معاشرے میں عورت کی پسماندگی کے اسباب کا ذکر کیا۔ تیسرے باب میں اردو ادب میں تانیثی فکر کی روایت اور چند اہم تانیثی مفکرین کا نسائی ادب اور ان کے کلام پر مرتب تانیثیت کو بیان کیا گیا ہے۔

باب دوم: کلام اقبال (اردو) میں خواتین کے حقوق کا تذکرہ اور آزادئ نسواں کے مسائل ہے۔اس باب میں کلام اقبال میں موجود ان اشعار کی تفہیم پیش کی گئی ہے، جن میں آزادی نسواں کے مسائل حقوق اور تعلیم کا تذکرہ ہے۔

باب سوم: اقبال کے خطبات اور دیگر نثری تحریروں میں خواتین کے مسائل کی تشریحات و توضیحات پر مشتمل ہے۔اس باب میں اقبال کا تصور عورت اور تانیثی تحریک کے نظریات کی وضاحت کی گئی ہے۔اسی تصور کی ذیل میں مقام و مرتبہ امومت، تعلیم نسواں، حقوق نسواں اور آزادئ نسواں جیسے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔اقبال کے نقطۂ نظر میں اسلامی معاشرہ اور عورت کا کردار، تنظیم معاشرت میں مرد کے ساتھ عورت کا حقیقی کردار اقبال کی توقعات مسلمان مشرقی عورت سے، ایک مشرقی عورت مسلمان عورت کے اوصاف اقبال کی نظر میں، اسلامی معاشرے میں عورت کے حقوق و فرائض اور ایک حقیقی مسلمان عورت کی کردار نگاری میں اقبال کا مجوزہ لائحہ عمل کو بہت جامعیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

باب چہارم: تانیثیت کی تحریک کے تناظر میں اقبال کے تصور عورت کا تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ ہے۔اس تحقیقی مقالہ کے چوتھے باب میں تانیثی فکر اور اقبال کے تصور عورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مشرقی و مغربی معاشرے کی عورت کا تجزیہ کیا گیا ہے اور فکرِ اقبال اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں عورت کی کردار نگاری کی وضاحت کی گئی ہے۔

اردو ادب میں نظم و نثر کے حوالے سے تانیثی اثرات اور عورت کے مقام و مرتبہ اور معاشرتی سطح پر حقوق کو اجاگر کرنے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔تانیثی تحریک کے نظریات کے مطابق جو آزادی اور حقوق مغربی معاشرے میں عورت کو حاصل ہیں، وہی مشرقی معاشرے کی عورت کو بھی ملنے چاہیئے۔ لیکن اس کے برعکس اگر معاشرے میں اسلام کا مکمل نفاذ کیا جائے تو ایسے معاشرے میں عورت کو وہ تمام حقوق میسر آتے ہیں جن کا تعین اسلام نے کیا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ عصری تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر اقبال کے افکار کو سمجھا جائے اور ان کے افکار سے رہنمائی حاصل کی جائے۔

بصد شکر تعالیٰ میں "**تانیثیت کے تناظر میں اقبال کا تصور عورت**" کے موضوع پر اپنا یہ تحقیقی مقالہ لکھنے میں کامیاب ہوئی۔ یہ مقالہ اقبال کے افکار کے سلسلے میں ایک ادنی سی کاوش ہے۔ میں اپنی اس کامیابی کا صحیح حق دار اپنے محترم و مکرم عزیز از جان والدین کو سمجھتی ہوں، جن کا شفقت بھرا سایہ اور پُر خلوص دعاؤں کی وجہ سے میں زندگی کے ہر کٹھن کام میں کامیاب ہوتی رہی اور یہ کامیابی بھی انہی کی دعاؤں کا ثمر ہے۔

میں مجسم تشکر ہوں اپنے اس تحقیقی مقالے کی نگران ڈاکٹر سائرہ بتول کی، جن کی قدم بہ قدم پُر خلوص رہنمائی نے میرا بھرپور ساتھ دیا اور میری غلطیوں کو محبت بھرے انداز میں سمجھاتے ہوئے درست کیا۔ اس کے بعد میں اپنے تمام محترم و مکرم اساتذہ کرام کی تہہِ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے اس تحقیقی مقالہ میں مدد فرمائی۔ بالخصوص محترمہ ڈاکٹر نجیبہ عارف، ڈاکٹر حمیرا اشفاق، ڈاکٹر صباحت مشتاق، ڈاکٹر شیراز فضل داد، ڈاکٹر ایوب صابر، ڈاکٹر شیراز زیدی اور ڈاکٹر مظہر علی کی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے اپنے قیمتی اور مفید مشوروں سے میرے اس تحقیقی کام سے متعلق قیمتی آرا سے نوازا۔ خدا کرے میرے تمام محترم و مکرم اساتذہ کرام کا شفقت بھرا سایہ تمام طلبا پر یونہی سلامت رہے۔

میں اپنی عزیز از جان بہنوں اور اپنی عزیز ہم جماعت دوستوں کی پُر خلوص دعاؤں اور ان کے محبت بھرے ساتھ کو کبھی بھی فراموش نہ کر پاؤں گی جنہوں نے مجھے ہمیشہ حوصلہ دیا اور تحسینی کلمات سے میرے حوصلے کو کبھی پست نہ ہونے دیا۔ میں خداوند تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ ان تمام کی دعاؤں، مخلص ساتھ اور حوصلہ افزائی کو ہمیشہ یونہی برقرار رکھیں۔

سجدۂ شکر اس ذات باری تعالیٰ کے لیے، جس نے انسان کو قلم سے علم عطا کیا اور ادراک و فہم کا شعور بخشا۔ درود و سلام اس ہستی ﷺ پر جو علم و نور اور ہدایت و رہنمائی کا منبع ہے۔

حفصہ فخر

اگست ۲۰۲۱ء

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
۱۔	**باب اوّل:**	
	الف: تانیثیت: فکری مباحث	۱
	ب: اردو ادب میں تانیثیت کی روایت اور اس کے اثرات	۱۲
	حوالہ جات	۲۴
۲۔	**باب دوم:**	
	کلامِ اقبال (اردو) میں خواتین کے حقوق کا تذکرہ اور آزادیٔ نسواں کے مسائل	۲۶
	حوالہ جات	۵۶
۳۔	**باب سوم:**	
	اقبال کے خطبات اور دیگر نثری تحریروں میں خواتین کے مسائل کی تشریحات وتوضیحات	۵۸
	حوالہ جات	۸۰
۴۔	**باب چہارم:**	
	تانیثیت کی تحریک کے تناظر میں اقبال کے تصورِ عورت کا تجزیاتی وتنقیدی مطالعہ	۸۲
	حوالہ جات	۹۳
	ماحصل	۹۵
	کتابیات	۱۰۱

باب اوّل:

تانیثیت: فکری مباحث

باب اوّل:

تانیثیت: فکری مباحث

تانیثی شعور ایک نظریاتی وابستگی بھی ہے اور ایک سیاسی تحریک بھی جو عورتوں کے لیے انصاف کے حصول اور معاشرے سے جنسی/صنفی فرق کے سدّباب کے لیے کوشاں ہے۔ تانیثیت کی اصطلاح ایک ایسے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کے لیے استعمال کی گئی جس میں عورت کو بحیثیت انسان اور سماج کا ایک فعال فرد سمجھنے کی کوشش مطلوب رہی ہے۔ یہ نظریۂ فکر طبقۂ نسواں کی معاشرتی زندگی اور حقوق کا حامی ہے۔ جو عورت کی عظمت اور مقام، حقوق و مساوات، آزادیٔ نسواں اور تعلیم نسواں کو تقویت بخشتا ہے۔ تانیثی نظریہ دنیا کو عورت کی نظر سے دیکھنے کا ایک طریقہ کار ہے جس کے تحت معاشرے میں خواتین کے لیے ترقی کے منصفانہ اور یکساں مواقع کی فراہمی اور صنفی مساوات اور معاشرتی تحفظ کو یقینی بنانے کا واضح لائحہ عمل متعین کیا گیا ہو۔

اصطلاحی لحاظ سے تانیثیت سے مراد عورت کے حقوق اور اوصاف ہیں اور اس کا معاشرتی، معاشی، سیاسی، نفسیاتی شعور ہے یعنی عورت کا اپنی ذات کا احساس اور شعور ہے۔ اب یہ شعور باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکا ہے اور مختلف ادوار میں تانیثی تحریک کو مختلف نام دیے گئے مثلاً بیداریٔ نسواں کی تحریک، حقوق نسواں کی تحریک، آزادیٔ نسواں کی تحریک، تعلیم نسواں کی تحریک اور تحریک نسواں وغیرہ۔ موجودہ دور میں اس کے لیے تانیثیت کی تحریک یا تانیثی تحریک استعمال کیا جاتا ہے جو اپنے اندر وسیع مفہوم رکھتا ہے اور عورتوں سے متعلق تمام پہلوؤں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور یہ تانیثی نظریہ ان تمام امور و معاملات کا احاطہ کرتا ہے جو عورتوں سے متعلق ہیں۔ انگریزی زبان میں تانیثیت کے لیے Feminism کا لفظ مستعمل ہے۔

لفظ تانیثیت اپنے اندر نسائیت، نسوانیت، جنسیت اور صنفی مساوات پر مبنی بے شمار مسائل اور جہات کو اس طرح جذب کیے ہوئے ہے کہ اس کی ایک جامع تعریف کرنا مشکل ہے۔

مشرق و مغرب کے مختلف تانیثی مفکرین نے اپنے ادراک کے مطابق تانیثیت کے معنی و مفہوم کو درج ذیل جملوں میں سمویا ہے:

> تہذیب و تمدن کی تاریخ سے عورت کا وجود غائب ہے۔ اس منفی رویے کو تبدیل کرنا اور ایسے ایجنڈے پر تنقید کرنا جو غیر مساوی سلوک کو تقویت دے فیمینزم ہے۔ فیمینزم نسائی شعور کی بیداری ہے۔ وہ شعور جو عورت کو بحیثیت انسان کے مقام و منصب میں کم تر سمجھنے کو رد کرتا ہے۔ اس میں عورت و مرد کی تخصیص نہیں۔[1]

(ڈاکٹر فاطمہ حسن)

"تانیثیت کا تصور عورتوں کے ذریعے خود اپنے تشخص کی تلاش، اپنے وجود کے آزادانہ اظہار اور مرد اساس معاشرے کے تمام تر اقدار و معیار پر سوالیہ نشان لگانے کے ساتھ ساتھ نئے اقدار و معیار کی تشکیل و تعمیر کی جہتوں کو وا کرنے سے عبارت ہے"۔[۲]

(انور پاشا)

"تانیثیت یا تانیثی تحریک اپنی ہر صورت میں دراصل جنسی مساوات کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ زندگی کے ہر شعبے میں مساوات کی حامی ہے اور سیاست، معیشت، سماج، روزگار، اختیارات، تاریخ، قوانین اور ادب میں جنس کی بنیاد پر ہونے والی تفریق اور عصبیت کی مخالفت کرتی ہے"۔[۳]

(مرتضیٰ علی اطہر)

"تانیثیت محض ادبی متون ہی نہیں۔ پوری انسانی تاریخ اور جملہ ثقافتی مظاہر کے مطالعے کا نیا تناظر فراہم کرتی ہے۔ یہ نیا تناظر دراصل وہ نئے سوالات ہیں جنہیں حقوق نسواں، آزادئ نسواں کی تحریکوں اور تانیثی تھیوری نے گزشتہ صدی میں تشکیل دیا ہے"۔[۴]

(ڈاکٹر ناصر عباس نیّر)

"Feminism is the belief that women should be allowed the same rights, power and opportunities as men and be treated in the same way, or the set of activities intended to achieve this state:

"She had a life long commitment to feminism".[۵]

(Cambridge Dictionary)

"Feminism is also a method of analysis, a stand point, a way of looking at the world from the prospective of women. It questions government policies, popular culture, ways of doing and being and asks how women's lives are affected by these ideological and institutional practices."[۶]

(Lisa S. Price)

درج بالا تانیثیت کی بیان کردہ تمام تعریفات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تانیثیت ایک فلسفۂ حیات اور اندازِ فکر کا نام بھی ہے اور ایک عملی تحریک بھی ہے لیکن اس کے باوجود اس کے پیچھے نہ کوئی تنہا نظریہ یا فلسفہ موجود ہے اور نہ ہی اس میں باقاعدہ منظم جدوجہد کا وہ تصور نظر آتا ہے جو تحریک کی اصطلاح سے وابستہ ہے۔

تانیثی تحریک کی اس جدوجہد کے دو پہلو ہیں۔

۱۔ فلسفیانہ / نظریاتی جدوجہد

۲۔ عملی جدوجہد

تانیثیت کے عملی جدوجہد کے پہلو سے دیکھا جائے تو مغرب میں رونما ہونے والی تحریک تانیثیت ذہن میں آتی ہے جس کا غلغلہ پندرہویں صدی عیسوی میں اٹھا۔ اس تحریک کے اثرات اردو ادب سمیت دنیا بھر کے علوم و فنون پر مرتب ہوئے۔ یہ تحریک ان خواتین نے شروع کی تھی جو سیاسی، سماجی اور معاشی وسائل مہیانہ ہونے کی صورت میں بہت سے مسائل کا شکار تھیں۔ اس تحریک کے علم برداروں میں مرد اور عورت دونوں نے حقوق و وسائل کی فراہمی کے لیے آواز بلند کی۔ جنہیں تانیثیت پسند Feminists کہا گیا۔ انہی میں کچھ ایسے مفکرین بھی پیدا ہوئے جنھوں نے تانیثیت کے نظری ڈسکورس میں حصہ لیا اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے مسائل پر بحث کی جس سے تانیثی تھیوری کی تشکیل عمل میں آئی۔

اس تحریک کے ابتدائی دور میں فرنچ/فرانسیسی میڈیکل ٹیکسٹ میں لفظ Feminist نسوانیت والے مردوں کے لیے استعمال کیا گیا۔ مغرب میں تحریک آزادی نسواں اس نظریے کے حامی مردوں کو بھی کہا گیا۔ بعد میں باقاعدہ لفظ Feminism تحریکِ نسواں کی اصطلاح بن گیا۔

حقوق نسواں یا آزادیٔ نسواں سے پہچانے جانے والی تحریک کے بنیادی نظریات میں سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، تعلیمی، اخلاقی اور تہذیبی طور پر دونوں جنس کے لیے مساویانہ حقوق ہیں۔ بالخصوص یہ تحریک نسائی حقوق سے متعلق تمام افکار کا مرکب ہے۔ اس تحریک کی خواتین علم برداروں کے لیے Womanist کی اصطلاح مستعمل ہے لیکن اس کے برعکس مروجہ لفظ /اصطلاح Feminism ہے۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد بین الاقوامی سطح پر سماجی و اقتصادی لائحہ عمل وجود میں لانا ہے جس میں ناروا سلوک، استحصال، جنسی جبر، دہشت، غیر مساوی حقوق، منافقانہ اخلاقی اقدار نیز فرسودہ خاندانی رشتوں کے علاوہ معاشرتی اقدار تک کی اس قدر آگہی پیدا کرنا کہ اجتماعی شعور بیدار ہو سکے۔

فطری طور پر دونوں جنس (مرد و عورت) کے درمیان سوائے جسمانی ساخت کے وحدت، قوت، تعقل اور مثبت اوصاف مساوی ہیں۔ اس تصور سے جنسی و صنفی شناخت کی تشکیل اور باہمی بیداری پیدا ہو کیونکہ دونوں نوع

انسانی کا حصہ ہے۔ تانیثی فکر ان تمام مروج نظام پر کاری ضرب لگا کر دونوں جنس کے باہمی شعور کو اجاگر کرتی ہے۔

اس ضمن میں عتیق اللہ رقم طراز ہیں کہ :

> تانیثیت کا موقف اس عورت کو Deconstruct کرنا ہے جو اپنی ذات ہی سے بے خبر نہیں تھی بلکہ اس سماجی، تہذیبی منظر نامے سے بھی نابلد تھی جس کے جبر نے اسے مجہول حقیقت میں بدل کر رکھ دیا تھا۔[۸]

تانیثیت کا دائرہ کار بہت وسیع ہے جس میں مذاہب، قوانین، سیاسیات، فلسفے، نفسیات، اخلاقیات، معاشی حقوق اور ایسی مثبت سوچ، مدبرانہ تجزیہ و دانش ورانہ اسلوب ہے جس کے اہداف میں نسائی حقوق و انصاف کی بالادستی، حریت فکر، آزادئ اظہار اور معاشرے کو ہر قسم کے استحصال سے بچنے کی ترغیب ہے جو ان کی سماجی، ثقافتی، معاشرتی، سیاسی، عمرانی اور ہر طرح کی تخلیقی اقدار و روایات کو مثبت انداز میں بروئے کار لانے کی راہ دکھاتی ہو۔ معاشرے کے تمام انسانی کاموں کو مساوی درجہ دینے کی جدتِ فکر ہی تانیثیت ہے۔

تانیثی فکری مباحث (مغربی تناظر میں):

اگر بنیادی طور پر تانیثیت کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے کہ اس تانیثی نظریے کا بنیادی مقصد کیا تھا۔ یہ تحریک کب، کیسے اور کن حالات میں ابھر کر منظرِ عام پر آئی اور مغرب میں تانیثیت کی تحریک کیسے وجود میں آئی تو ان الجھنوں کے سلجھاؤ کے لیے یہاں انقلاب فرانس کے بعد کی کچھ سرگرمیوں پر روشنی ڈالنا ضروری ہے جو خواتین کے حقوق کی فراہمی میں تحرک کا باعث بنی۔

۱۷۹۱ء میں فرانس کی قومی اسمبلی میں **چارلس موریس**[۹] نے صنفی تضادات پر مبنی ایک تعلیمی خاکہ پیش کیا تھا جس میں عام تعلیم کا حق مردوں کے ساتھ مخصوص کیا گیا اور عورتوں کے لیے صرف گھریلو بنیادی تعلیم کی تجویز رکھی گئی۔ اس پیش کی گئی شق کے جواز کی یہ دلیل دی گئی کہ مرد کو دنیا سنبھالنی ہے اس لیے مرد کو اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہے یعنی مرد پر جو ایک خاندان کی معاشی ذمہ داری عائد ہے تب اسے پورا کرنے کے لیے مرد کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے ،تب ہی وہ برسرِ روزگار بن کر ذمہ داریاں نبھا سکتا ہے جب کہ عورت کے ذمہ گھر کی دیکھ بھال کرنا اور صرف گھریلو امور انجام دینا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے گھریلو اور بنیادی تعلیم ہی کافی ہے۔

فرانس میں ہی مقیم ایک برطانوی خاتون "میری وال اسٹون کرافٹ[۱۰]" (Mary Wall Stone

(Craft نے چارلس موریس کی اس رپورٹ کے رد میں ۱۷۹۲ء میں *A Vindication of the Rights of Women* کے عنوان سے ایک آرٹیکل لکھا۔ میری وال اسٹون کرافٹ نے عورتوں کے تعلیمی حق کے فراہمی کی وکالت کرتے ہوئے کہا:

> عورت اپنے شوہر کی فقط بیوی ہی نہیں بلکہ عورت بھی سماج اور ملک کا لازمی حصہ ہے۔ عورت کو معاشرے کا قیمتی زیور اور شادی میں بیچ دی جانے والی جائیداد کی بجائے انسان سمجھنا چاہیے اور بحیثیت انسان ان کے بنیادی حقوق انہیں ملنے چاہئیں۔[11]

اسی طرح اس تانیثی مفکر خاتون نے نا صرف عورتوں کے حقوق کے لیے نعرہ بلند کیا بلکہ مردوں کو بحیثیت عام شہری وسائل و سہولیات نہ ملنے کی صورت میں مرد کے حق میں بھی آواز اٹھائی۔ جس طرح چارلس موریس نے صنفی تضاد پر ایک کانفرنس میں اپنا خاکہ پیش کیا تھا اور اس رپورٹ کی رد میں میری وال اسٹون کرافٹ نے اپنا آرٹیکل پیش کیا اور عورتوں کے حق میں طرف داری کی۔ اسی طرح اس نے مردوں کے حق میں بھی ایک آرٹیکل لکھا *A Vindication of Rights of Men*۔ یہ آرٹیکل فرانسیسی فلاسفر ایڈمنڈ برک کی تصنیف *Reflection on the Revolution in France* کی رد میں لکھا گیا تھا۔ ایڈمنڈ برک نے اپنی کتاب میں یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ انقلابِ فرانس درست نہیں اور عام شہریوں کو حقوق حاصل نہیں۔ اس سلسلے میں میری وال اسٹون کرافٹ نے مردوں کے حق میں آرٹیکل لکھ کر عام شہریوں کے حقوق کی وکالت کی اور انقلاب کو درست ٹھہرایا۔

اس ضمن میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد فرانسیسی معاشرہ زبوں حالی کا شکار تھا۔ نا صرف عورتوں کو ان کے حقوق کی پاسداری تھی بلکہ مردوں کو بھی ان کے معاشرتی حقوق و وسائل مہیا نہ تھے۔ ایسے گومگو حالات میں میری وال اسٹون کرافٹ ایک ایسی تانیثی مفکر منظرِ عام پر آئیں جنھوں نے مرد و عورت کے حق میں سیاسی، سماجی اور معاشی سطح پر برابری کے لیے آواز اٹھائی اور مرد و عورت کے یکساں انسانی حقوق کا تانیثی نظریہ فکر کی صورت میں علم بلند کیا.

بنیادی طور پر تانیثیت کی تاریخ عورت اور مرد کے درمیان کیے جانے والے فرق پر ہے. مرد اساس معاشرے میں نظر انداز ہونے یا غیر اہم قرار دیے جانے والے ان احساسات، جذبات، حقوق اور مسائل کو سمجھنے کی کوشش ہے جن کا تعلق عورت سے ہے. تانیثیت مرد کی جبریت کا انکار کرتی ہے زندگی کے ہر شعبے میں مرد کی

موضوعیت کو چیلنج کرتے ہوئے برابری کا دعوی کرتی ہے. تانیثیت محض مردوں کے بنائے ہوئے قوانین پر سوال ہی نہیں اٹھاتی بلکہ اس کے متبادل ایسی اقدار و روایات کی تشکیل کا بیڑا بھی اٹھاتی ہے جس سے معاشرے میں مرد کی برتری اور عورت کی کمتری کا خاتمہ ہو سکے۔ تانیثیت عورت کے جذبات، احساسات، افعال اور مسائل کو مرد کے بنائے ہوئے پیمانے سے دیکھنے کی بجائے خود عورت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ عورت کی فطرت، جبلت اور افعال کی تشریح میں کارفرما مرد کی محکومیت پر سوال اٹھاتی ہے۔

تحریکِ تانیثیت کا اس انقلابی پہلو کا مقصد استحصال زدہ معاشرے کی شعوری آگاہی اور بیداریٔ فکر ہے جو میری وال اسٹون کرافٹ اور سیمون ڈی بوائر کی تحریری کاوشوں سے ممکن ہو سکی جنھوں نے اپنی تحاریر کے ذریعے معاشرتی، طبقاتی اور معاشی تفریق کو مٹانے کی طرف توجہ مبذول کروائی اور ان کی تحریروں کے نتیجے میں جنم لینے والی فکر میں معاشرتی تنقیدی شگاف پیدا ہوئے۔ اُن کو پُر کرنے کے لیے نئی بحثوں نے جنم لیا جس سے تانیثیت کی حدود اور امکانات میں وسعت آتی گئی۔

۱۸۴۸ء میں نیویارک کے ایک شہر Sceneca falls میں پہلی بار چند باہمت مرد و خواتین نے حقوق نسواں کی بحالی کے لیے باضابطہ ایک میٹنگ کی جس میں *Declaration of Rights and Sentiments* کے عنوان سے ایک قرارداد پیش کی گئی۔ اس قرارداد میں ایک طاقتور عورت کا تصور پیش کیا گیا جو کہ میری وال اسٹون کرافٹ کی تحریروں میں نہ تھا۔ ایک بااختیار عورت کے پیش کیے گئے تصور کی اس قرارداد پر دستخط کرنے والوں نے یہ اعتراف کیا کہ ایک عرصہ عورتوں کو اعلیٰ تعلیم سے محروم رکھا گیا جس کی وجہ سے وہ ڈاکٹر، وکیل اور انجینئر جیسے دیگر اہم پیشوں تک رسائی حاصل کر کے اپنی قابلیت کا لوہا نہ منوا سکیں۔ مغربی معاشرے میں عورت کو سیاسی امور میں بھی دخل اندازی کا کوئی حق نہ تھا۔ اسی لیے انہیں ووٹ دینے کا بھی حق حاصل نہ تھا۔ یورپی انقلابی دور میں جہاں عورت کو تعلیم اور حقوق کی آزادی نہ تھی۔ وہیں یہ تصور بھی عام تھا کہ سیاست کے لیے ذہانت و فطانت درکار ہے جب کہ عورت فطری طور پر عقلمندی اور دانشوری سے محروم ہے۔ لیکن ۱۹۲۰ء کی دہائی میں ایک آئینی ترمیم کے ذریعے بالآخر امریکہ میں عورت کو ووٹ دینے کا حق مل گیا۔ تاہم اس کے بعد مغربی معاشرے میں عورت کو تعلیم حاصل کرنے اور ملازمت کرنے کی اجازت ملنے لگی۔

دوسری جنگِ عظیم تک مغربی معاشرے میں عورت کا گھر سے باہر ملازمت کی غرض سے نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ان تمام صورت حال کو برداشت کر لینے کے بعد بھی بے شمار سماجی و معاشرتی مسائل، ملازمت پیشہ خواتین کی

زندگی کو مشکل بنانے اور عملی زندگی میں ان کی حوصلہ شکنی کے لیے درپیش آجاتے۔ان تمام مسائل ومشکلات سے نبٹنے کے لیے کچھ ایسی خواتین منظرِ عام پر آئیں جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے تمام خواتین کو اپنے حقوق کے حصول کے لیے آواز بلند کرنے پر ابھارا۔ عورتوں کے حق میں قلم کاری کرنے والوں میں خواتین کے ساتھ ساتھ مردوں نے بھی اس تحریک میں حصہ ڈالا اور عورتوں کی محکومیت اور ناجائز پابندی کے خلاف اور ان کے حقوق کی آزادی کے حق میں آواز اٹھائی اور اپنی تحریروں کے ذریعے حقوق نسواں کی آواز کی حمایت کی۔

تانیثی تحریک کے علمبردار:

بنیادی طور پر تانیثیت کا شور پندرھویں صدی عیسوی میں یورپ میں اٹھا لیکن اس تانیثی آواز میں مدوجزر کی کیفیت سامنے آتی رہی۔ یہ آواز ٹھہرے پانی میں ایک پتھر کی مانند تھی جو کہ صنفی تضادات اور مساویانہ حقوق کے حصول کے لیے پانی میں ایک پہلی لہر ثابت ہوئی لیکن اس تحریک / نظریے کو باقاعدہ ۱۹۲۰ء میں ایک آئینی ترمیم کے ذریعے عمل میں لایا گیا جس میں عورت کو سیاسی امور میں دست اندازی کے لیے ووٹ کا حق دیا گیا۔

اس تانیثی نظریے کو جن لکھاریوں اور حمایت کاروں نے اپنی تحریروں کے ذریعے لوگوں میں شعور اجاگر کیا اور جن کی تحریروں سے حقوق نسواں کی جدوجہد کو بھی تقویت ملی۔ان چند تانیثی علمبردار مفکرین کے نام اور تصانیف درج ذیل ہیں:-

۱۔ میری وال اسٹون کرافٹ (Mary Wall Stone Craft) ایک برطانوی مفکر خاتون جس نے ۱۷۹۲ء میں اپنی ایک تحریر *A Vindication of the Rights of Women* لکھ کر خواتین کے حقوق کی حمایت کی انہیں سماج کا ایک لازمی حصہ قرار دیا اور عورت کو بحیثیت انسان تمام بنیادی حقوق کی فراہمی کے لیے اپنی تحریر کے ذریعے آواز بلند کی۔ یہ خاتون میری وال اسٹون کرافٹ تانیثی تحریک کی بانی کے طور پر ابھر کر سامنے آئیں۔

۲۔ مارگریٹ فُلر (Margaret Fuller) ایک امریکی صحافی اور تانیثی نظریے کی مفکر خاتون جس نے ۱۸۴۵ء میں خواتین کے حقوق کے حوالے سے ایک کتاب *Women in the 19th Century* لکھی جس میں انیسویں صدی میں رہنے والی عورت کے مسائل ومشکلات، عورت کی محکومیت، تعلیم اور حقوق کی پابندی (جیسے سماجی ومعاشرتی مسائل) کو موضوع بحث بنایا۔

۳۔ جان سٹوارٹ مل (John Staurt Mill) ایک برطانوی فلسفی، مفکر اور ادیب جس نے انیسویں صدی میں برطانیہ میں حقوق نسواں کی آواز کی حمایت کی اور ۱۸۶۹ء میں خواتین کی مغلوبیت اور محکومیت کے موضوع پر ایک کتاب *The Subjection of Women* کے ذریعے تانیثی نظریے کی فلسفیانہ اساس پر گفتگو کی۔ جان سٹوارٹ مل نے معاشرے میں عورتوں کو مساوی رتبہ دینے کا ترقی پسند نظریہ پیش کیا۔ اس نے ایسے سماجی اور قانونی اصول کی سخت تنقید کی جن سے سماج میں عورتوں کی آزادی پر ممانعت ہے۔ اس نے اپنی تحریروں میں مرد اساس رویے میں تبدیلی لانے کی ضرورت پر زور اور عائلی زندگی میں عورت کو محکوم یا مملوک بنانے کی بجائے انہیں زندگی کے ہر موڑ پر برابر کا شریک سمجھنے کی وکالت کی۔

۴۔ فریڈرک اینگلز (Friedrich Engels) ایک جرمن صحافی اور مفکر جس نے حقوق نسواں کے حق میں بلند ہونے والی آواز کی حمایت کی اور اسی ضمن میں فریڈرک ــــ اینگلز نے اپنا ایک آرٹیکل *The Origin of the Family, Private Property and the State* لکھا جس میں اس نے خاندان کا آغاز، ذاتی ملکیت اور انسانی معاشرے کی ترقی یافتہ ریاست کے ارتقاء کا انحصار، سماج کے معاشی اور معاشرتی حالات کی تغیر پذیری پر بتایا ہے۔ ایسے معاشرتی حالات میں جہاں عورت کا استحصال، ان پر ظلم و ستم اور جابرانہ رویے، محکومیت اور مغلوبیت، پدری نظام اور مردانہ اقتدار، سماجی سطح پر ارتقاء کو روکنے کا باعث ہے۔ فریڈرک اینگلز نے پدری سماجی نظام اور مردانہ اقتدار و قوت کے خلاف اپنے اس کالم میں لکھا ہے۔

۵۔ ورجینیا وولف (Virginia Woolf) ایک انگریز مفکر اور تانیثیت کی ادبی نظریہ سازی میں ایک رہنما جس نے عالمی جنگ کے بعد دنیا میں سیاسی، معاشی اور سماجی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کا شعوراتی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا۔ ورجینیا وولف نے ۱۹۲۹ء میں *A Room of One's Own* اور ۱۹۳۸ء میں *Three Guineas* دو کتابیں لکھی۔ جس میں بہت واضح طور پر عورتوں کو تعلیم کے حصول اور شادی کے معاملے میں عدم مساوات کے موضوع کو زیرِ بحث لایا گیا۔ اس نے سماجی، سیاسی، معاشی اور ادبی یعنی زندگی کے ہر شعبے میں عورت اور مرد کے درمیان تفاوت اور تفریق پر مبنی فکر اور رجحان کو سرایت کرتے ہوئے پایا۔ اس نے اپنی تحریروں کے ذریعے اس بات کی وضاحت کی کہ گھریلو زندگی میں بیویوں اور بیٹیوں پر والد اور شوہر کے تسلط اور حاکمیت سے لے کر عام زندگی میں تجارت، قانون، تعلیم اور مذہبی معاملات میں عورتوں کو مردوں کی محکومی اور تابعداری تفویض کی گئی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ طاقت اور قوت کے عدم توازن اور مردانہ حاکمیت و اقتدار کا یہ نظام ادب میں بھی مسلط نظر آتا ہے۔

ور جینیا وولف نے جب مردوں کے ادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا تو ان کے ادب میں عورت کے کردار کی نمائندگی کو فعالیت سے محروم پایا۔ اس نے اس اہم نکتے کی طرف توجہ دلائی کہ عورت کو اس کے نسائی چہرے اور نسائی جسم نے ادیب بننے نہیں دیا اور عورت ہونے کی وجہ سے اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارا نہیں گیا۔ اس نے عورت کی تعلیم اور تعلیم یافتہ معاشرے کے لیے تعمیر و تشکیل پر زور دیا۔

۶۔ سیمون دی بوار (Simone de Beauvior) ایک فرانسیسی مفکر اور ادیبہ کی کتاب دوسری جنگِ عظیم کے بعد ۱۹۴۹ء میں *The Second Sex* منظرِ عام پر آئی۔ یہ کتاب تانیثیت کی سنگِ میل سمجھی جاتی ہے۔ *The Second Sex* میں تانیثیت کو موضوعِ بحث بنایا اور حیاتیاتی، نفسیاتی اور تاریخی مادیت کی بنیادوں پر عورت کے وجود کو سمجھنے اور اس کی اہمیت سمجھانے کی کوشش کی۔ سیمون نے عورت کے وجود سے متعلق کئی مباحث چھیڑے۔ مثال کے طور پر

- عورت کیا ہے؟
- کیا عورت کا وجود قائم بالذات ہے یا اضافی؟
- کیا صنفِ مخالف کی موجودگی سے ہی اس کے وجود کا تعین ممکن ہے؟
- اگر تذکیر کے بغیر تانیث کا وجود نہیں ہے تو پھر اس قاعدے کی رُو سے تذکیر بھی اپنے وجود کے تعین کے لیے تانیث کی محتاج ہے تو پھر ایسا کیوں ہے کہ عورت ہی مرد کی نسبت سے پہچانی جاتی ہے؟
- مرد کے لیے عورت کی نسبت سے پہچان تذلیل کی بات کیوں سمجھی جاتی ہے؟

اسی طرح سیمون نے اپنی دوسری کتاب *Women: Myth and Reality* میں عورت اور مرد کے روایتی تصور کو رد کیا۔ اس کے خیال کے مطابق مرد کو اپنی مردانگی اور عورت کو اپنی نسوانیت ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے اپنی تحریروں کے ذریعے نسائیت کا رشتہ وجودیت اور نفسیات سے استوار کیا۔

۷۔ بیٹی فرائڈن (BettyFrieden) ایک امریکی حقوق نسواں کی مصنف اور متحرک کارکن جو تانیثی تحریک کی اہم شخصیت بھی تھی۔ اس کی بیسویں صدی میں کئی تانیثی تحریریں سامنے آئیں۔ بیٹی فرائڈن نے ۱۹۶۳ء میں ایک کتاب *The Feminine Mystique* لکھی جس کے ذریعے اس نے صدیوں پرانے معاشرتی تصور پر ضرب لگائی کہ گھر اور اولاد کے ذریعے عورت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ایسے روایتی باطل تصورات کا شکار

ہو کر عورت اپنی شناخت گم کر چکی ہے۔اس تانیثی مفکر نے عورت کے حقوق اور آزادی، معاشی و سماجی مساوات کے حصول کو اپنا مطمع نظر بنایا۔

بحیثیت ایک دبستانِ فکر، تانیثیت نے ہر شعبۂ زندگی کو متاثر کیا۔ بشریات، سماجیات، معاشیات، نفسیات، مذہب، سیاست، قانون، فلسفہ، میڈیا بلکہ ہر مضمون میں نسائیت کی فکر اور فلسفے کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ آج دنیا بھر میں عورتوں کی لیڈر شپ اور علمی و فنی میدانوں میں عورتوں کی برتری نے دانشوروں، طالب علموں اور اساتذہ کو نسائیت کی تحریک کا مطالعہ کرنے پر اُبھارا ہے۔

تانیثیت کئی ایک نظریات پر مبنی ہے مگر عورت کا استحصال کسی مخصوص معاشرے کا رویہ نہیں۔ مشرق و مغرب کی یہ تحریکیں صنفی امتیازات کے رویوں کا واضح ثبوت ہیں۔ عورت کے استحصال کی صورت حال کا خاتمہ، شخصی آزادی کا قیام، صنفی امتیاز کے رویوں کے خلاف آواز بلند کرنا اور حقوق کی فراہمی وغیرہ تانیثی تحریک کا اصل مقصد و منشا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ عورت جنس کی بنیاد پر ناانصافی اور عدم مساوات کا شکار رہی ہے۔ تانیثی نظریے کے تحت انہی امتیازات کی نشاندہی اور ان کا خاتمہ مقصود ہے۔ تانیثی تحریک محض عورت کے حقوق کی جنگ نہیں بلکہ اصل تانیثی کارکن وہ ہے جسے نہ صرف معاشرے میں عورت کی سماجی حیثیت کا ادراک ہو بلکہ معاشرتی سوچ کی تبدیلی کا عزم بھی رکھتا ہو۔

تانیثیت کا تعلق محض نظریے سے نہیں بلکہ عمل سے ہے۔ اس تحریک کا مقصد اس استحصال کے خلاف کچھ کر کے دکھانے سے ہے جو عورتوں کے سیاسی مطالبات، مساوی تنخواہ کے حصول کی کوششیں، سماجی اداروں میں مردوں کے برابر طاقت کا حصول، ان تمام استحصالی معاملات کا تعلق سماجی، تہذیبی اور ثقافتی اقدار سے ہے۔ اس استحصالی صورت حال کی نمائندگی تانیثی تحریک نے کی جس نے عورتوں میں شعور اور آگاہی پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس تحریک کے زیرِ اثر عورتوں کی تعلیم، ماحول اور رسم و رواج کے مطابق تانیثی مطالبات راہ پاتے رہے۔ بنیادی طور پر تانیثی تحریک کا مقصد معاشرے میں ایسی صورت حال کا حصول ہے جہاں افراد معاشرہ کو زندگی گزارنے کے مساوی مواقع میسر ہوں۔ تانیثیت کا تو آغاز ہی معاشرے میں رائج اس مجموعی انسانی صورت حال کے خلاف جدوجہد سے ہوتا ہے جس میں مرد طاقت ور اور غالب ہے جہاں عورت کو فرد اور انسان کی حیثیت سے دیکھنے کی بجائے ایک عورت کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔

تانیثی تحریک جن محرکات و ترجیحات کے سبب پروان چڑھی، ان میں سے چند نکات درج ذیل ہیں۔

۱۔ عورت کو اپنی زندگی کے فیصلے کرنے کا اختیار حاصل ہو۔ معاشی، سیاسی اور ازدواجی ہر شعبے میں وہ اپنے راستوں کا انتخاب خود کر سکے۔ انتخاب کی یہ آزادی عورت کو عورت پن سے ترقی دے کر انسان کا درجہ دے گی۔

۲۔ قانونی، انتظامی اور سیاسی اداروں میں عورت کو فیصلے کے اختیار پر مبنی موثر نمائندگی حاصل ہو۔

۳۔ قانون سازی میں عورت اور مرد کو مساوی حقوق حاصل ہوں کیونکہ آزادئ نسواں کی تحریک کا آغاز بھی قانون میں موجود اسی تفریق سے ہوا تھا۔

۴۔ Equality کی بجائے Equity قائم کی جائے۔

۵۔ خاندان میں عزت واحترام کے ساتھ ساتھ مقامات کار پر بھی عورت کو جسمانی کشش کی نذر کرنے کی بجائے اسے انسان سمجھا جائے۔

۶۔ حیاتیاتی نرومیت کی بناپر مرد اور عورت کی تخصیص جن کاموں میں ہے، انہیں عورت کی مجبوری یا کمزوری سمجھنے کی بجائے ایک دوسرے کے دائرہ کار کا احترام کیا جائے۔

مندرجہ بالا تمام نکات تانیثی تحریک / نظریے کی اساس تھے جن کے حصول کے مقصد کے لیے مغرب میں آواز بلند ہوئی اور عورت کو اپنے حقوق و مسائل کے بارے میں بولنے کا موقع ملا۔ اس طرح خواتین کے بنیادی مسائل، معاشی اور سماجی مساوات اور انصاف، تعلیم اور روزگار کے مساوی مواقع اور معاوضے، جنسی جبر واستحصال سے نجات، باعزت ازدواجی رشتے، مساوی حقوق اور سیاسی اقتدار میں شرکت وغیرہ میں عورتوں کو سہولت میسر آئی۔

تاہم تانیثی تحریک کا دائرہ بہت وسیع ہے جس میں مذاہب، قوانین، سیاسیات، فلسفہ، نفسیات، اخلاقیات، معاشی حقوق اور ایسی مثبت سوچ، مدبرانہ تجزیہ و دانشورانہ اسلوب ہے جس کے اہداف میں نسائی حق وانصاف کی بالادستی، حریت، فکر، آزادئ اظہار اور معاشرے کو ہر قسم کے استحصال سے بچنے کی ترغیب ہے جو ان کی سماجی، ثقافتی، معاشرتی، سیاسی، عمرانی اور ہر طرح کی تخلیقی اقدار و روایات کو مثبت انداز میں بروئے کار لانے کی راہ دکھاتی ہو۔ معاشرے کے تمام انسانی کاموں کو مساوی درجہ دینے کی جدتِ فکر ہی تانیثیت ہے۔

(ب) اردو ادب میں تانیثیت کی روایت اور اس کے اثرات

تانیثیت کا نظریہ دراصل سماجی، سیاسی، معاشی، مذہبی، تعلیمی اور پیشہ ورانہ سطح پر صنفی مساوات قائم کرنے کے لیے متعارف ہوا اور اس نظریے کو عورتوں کی سیاسی و سماجی تحریکوں اور حقوقِ نسواں کے لیے کام کرنے والی تنظیموں اور اداروں نے بھی اپنے منشور کا حصہ بنالیا۔

تانیثی تحریک کا نظریہ اگرچہ مغرب سے پروان چڑھا لیکن اس کے اثرات پوری دنیا کے ادب پر واضح طور پر مرتب ہوئے۔ عالمی ادب میں تانیثیت ایک اہم ادبی نظریے کے طور پر روشناس ہوا جس کا ایجنڈا مختلف سطحوں پر خواتین کے تشخص، صنفی امتیاز، عدم مساوات اور سماجی مسائل رہے ہیں۔ اس ادبی نظریے نے جلد ہی باضابطہ تحریک کی شکل اختیار کرلی اور پوری دنیا سمیت ہندوستان میں بھی پوری شدومد کے ساتھ اس تحریک کے اثرات پھیلنا شروع ہو گئے۔ اس طرح اس تحریک کے تحت ہندوستان کی خواتین نے سماجی رسم ورواج اور بے جا پابندیوں کے خلاف بے اطمینانی کا اظہار تحریری شکل میں کرنا شروع کر دیا۔ خواتین قلم کاروں نے اپنی تحریروں کے ذریعے ہندوستانی عورتوں کو ان کے حقوق و مسائل کے بارے میں شعور و آگاہی دی۔ چنانچہ خواتین حقوق، مرتبہ، معاشرتی حیثیت اور تعلیم سے آگاہی کا نقطہ آغاز رشیدۃ النساء کے ناول اصلاح النساء (۱۸۸۱ء) کو مانا جاتا ہے۔ یہ ناول ہندوستان میں تانیثی تحریک کا پہلا ثمر اور نثر میں نسوانی ادب کا نقطہ آغاز ثابت ہوا۔

ہندوستان میں انیسویں صدی کا آخری حصہ اور بیسویں صدی عورتوں کی آزادی کی جدوجہد کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ اسی دور میں سرسید احمد خان نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ اس کا بنیادی مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو ذہنی، معاشرتی اور اخلاقی پستی سے نکالنا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جب تک مردوں کے ساتھ عورتوں کی تعلیم و اصلاح اور مذہبی عقائد و رسومات کو درست نہ کیا جائے تب تک ایک بہترین معاشرہ تشکیل نہیں پاسکتا۔ علی گڑھ میں ۱۹۰۴ء میں عورتوں کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں عورتوں کی آزادی اور تعلیم کے سلسلے میں بہت سے فیصلے کیے گئے۔ عورتوں میں تعلیم کے شعور کو بیدار کرنے کے لیے خاتون نام کا ایک رسالہ بھی جاری کیا۔

اردو ادب میں خواتین کا ادب، جس میں خواتین کے سماجی مسائل موضوعات کی شکل میں سامنے آئے۔ اس تانیثی ادب کی شروعات انیسویں صدی کے آخر میں ہوئی۔ اس دور میں خواتین ادیبوں کی تحریروں کا ایجنڈا ڈپٹی نذیر

احمد نے تیار کیا۔ انہوں نے اپنے شاہکار ناول مراۃ العروس کے ذریعے اصغری کے کردار میں اردو ادب میں ایک ایسا رول ماڈل پیش کیا جو دینی علوم کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم، تاریخ، سائنس، جغرافیہ کے علم کا ماہر تھا۔ اس کردار کے ذریعے معاشرے میں اصلاح، بہتری اور مثبت سوچ اور رویے کو فروغ دیا گیا۔ اصغری اگر تمام علمی اور اخلاقی خوبیوں کا مجموعہ تھی تو اکبری کا کردار اس کے متضاد تھا۔ در حقیقت ڈپٹی نذیر احمد اور ان کے بعد آنے والی خواتین قلم کاروں کے نزدیک مسلم خواتین کی تعلیم کا مسئلہ نہایت اہم تھا۔ اس لیے وہ اپنی تحریروں کے ذریعے، جس کو وہ اصلاح نساء کہتے تھے، اس کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کے بعد رشیدۃ النساء، اکبری بیگم، محمدی بیگم، مسز عباس طیب، صغرا ہمایوں مرزا، عباسی بیگم، حسن بیگم، بیگم شاہنواز، مسز عبدالقادر اور نذر سجاد حیدر کے ناول شائع ہوئے۔ خواتین ناول نگاروں کا یہ سفر ۱۹۱۳ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ ان میں سے بہت سے ناول اب نایاب نہیں۔ لیکن جتنا مواد بھی دستیاب ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان ادیباؤں کے موضوعات میں تعلیمِ نسواں اور خواتین کے معاشرتی مسائل سے متعلق موضوعات شامل ہیں۔ اپنی ان تحریروں کے ذریعے وہ خواتین کو ایک مثالی خاتون بننے پر مائل کرتی ہیں۔ ان خواتین قلم کاروں کی تخلیقات نسوانی شعور کی بیداری اور خواتین کے سماجی، خانگی اور تہذیبی مسائل سے ان کی آگہی کے نقوش فراہم کرتی ہیں۔

بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جہاں خواتین قلم کار معاشرے کی اصلاح اور خواتین کے مسائل کی طرف توجہ دلانے اور خواتین میں شعور و آگہی بیدار کرنے میں متحرک تھیں۔ وہاں یہ خواتین تحریکِ آزادی میں بھی شانہ بشانہ ساتھ تھیں۔ مثال کے طور پر نذر سجاد حیدر کے ناول آہِ مظلوماں جو کہ ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں کثیر الازدواجی یعنی (Polygamy) سے پیدا شدہ مسائل کا بہت وضاحت سے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ موضوع خواتین میں خاصا متنازعہ رہا ہے۔ اس کے علاوہ کئی مسلم خواتین انجمنیں بھی وجود میں آئیں جن سے منسلک ہو کر خواتین نے فہم و ادراک حاصل کیا۔

ابتدائی اردو ادب میں تانیثی رجحان:

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے اردو ادب میں تانیثی رجحانات کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یہ رجحان دو طرح کے تھے۔ ایک رجحان خالص تانیثی شعور تھا اور دوسرا تانیثی لب و لہجہ۔ اسی ضمن میں رشید جہاں کا نام سامنے آتا

ہے۔ جن کے افسانوی مجموعہ انگارے (۱۹۳۲ء) کی کہانیوں میں سماج میں عورتوں اور مردوں کے لیے مروجہ دو الگ الگ معیاروں اور اخلاقی اصولوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کی تحریروں کے موضوعات جذبات، کیفیات، نفسیاتی اور ردّ عمل کے ہیں۔

عصمت چغتائی:

خواتین اردو ادب میں تانیثیت کی سب سے پہلی واضح آواز عصمت چغتائی کی ہے۔ عصمت کا لب ولہجہ، ان کا آہنگ اور اندازِ تحریر خالص تانیثی ہے۔ اردو ادب میں ان کی تحریریں تانیثی حسّیت اور تانیثی شعور کے اظہار کا پہلا تجربہ ہیں۔ عصمت کے موضوعات منفرد ہیں۔ سماجی حالات پر ان کا ردّ عمل بھی جداگانہ ہے۔

عورت کے جذبات، کیفیات، عورت کے سماجی حالات کی عکس بندی، ان کا نفسیاتی ردّ عمل، خواتین اردو ادب میں ایک نیا تجربہ ہے۔ عصمت چغتائی لکھتی ہیں کہ:

> قدسیہ خالہ کے طور بھی بدلے نظر آرہے ہیں۔ اب وہ راشد الخیری کی صبح غم اور شام زندگی پڑھ کر ہچکی باندھنے کی بجائے مثنوی زہر عشق چھپا کر پڑھتیں اور راتوں کو گھنٹوں صحن میں ٹہلا کرتیں۔ پھر وہ ہم میں سے کسی کو اکساتیں، شبیر ماموں سے کہو نا، سرکار مدینے والے سنائیں۔ ہمیں "سرکار مدینے والے" سے آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی، زیادہ پسند تھا۔[۱۲]

مردوں اور عورتوں کے سلسلے میں دو متضاد سماجی اقدار اور رویوں کو فنکارانہ انداز میں وہ یوں اجاگر کرتی ہیں:

> وہ ایک کمزور عورت ہوتے ہوئے بھی اپاہج اور مجبور نہیں تھیں۔ مردوں کے تمام حقوق انہیں حاصل تھے۔ رات برات اکیلی جہاں چاہتیں، اونچی آواز سے اعلان عشق کر دیتیں اور اونچی آواز سے الاپتیں۔ آوازے کستیں، دھڑ سے گالی بک دیتیں۔ مردوں کے ساتھ بیٹھ کر قوالی سنتیں اور چھنا چھن روپے پھینکتیں۔[۱۳]

درحقیقت دل کی دنیا ناولٹ موضوع کے اعتبار سے بہت حساس ہے۔ عصمت چغتائی کے افسانے اور ناولٹ ایک تانیثی ذہن، تانیثی شعور اور تانیثی ادراک کی سمتوں کا پتہ دیتے ہیں۔

اردو ادب میں تانیثی رجحان کا سلسلہ رشید جہاں اور عصمت چغتائی پر ہی ختم نہیں ہوتا بلکہ اور بھی خواتین قلم کاروں میں تانیثی رجحانات کے خدوخال نظر آتے ہیں۔ بشریٰ رحمن کے افسانوں میں تانیثی رجحان اور نسائی حقوق کی تفصیلات ملتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

قرۃ العین حیدر نے سماجیاتی، ثقافتی اور سیاسی و فلسفیانہ پس منظر میں اپنی تخلیقات رقم کیں۔ ان تخلیقات نے خود بینی اور جہاں بینی کی بہترین عکاسی کی ہے۔ قراۃ العین حیدر نے اپنی تحریروں میں کرداروں کے ذریعے خواتین کو جذباتی، ذہین اور طاقت ور بنا کر پیش کیا۔ ایک ایسی مثالی عورت کا کردار مردوں کی برابری کرتی ہو۔ باشعور صاحب رائے جو عالمی سطح پر ادبی و تاریخی نظر رکھتی ہو، گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ بھی سہتی ہو اور فرسودہ روایات کو توڑ کر خود مختاری کا اعلان بھی کرتی ہو۔ ایسی بہادر کردار کا تصور قراۃ العین حیدر کی تحریروں میں ملتا ہے۔

اگرچہ چوتھی صدی عیسویں میں برصغیر کے سماجی نظام میں یہ گنجائش بہت کم تھی کہ خواتین تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کر سکیں اور انہیں پڑھنے لکھنے کی آزادی بھی نہیں تھی اور یہ بھی اجازت میسر نہ تھی کہ ان کے اپنے نام سے خطوط آئیں۔ اسی وجہ سے بہت سی خواتین قلم کار اپنی پہچان پوشیدہ نام سے لکھتی تھیں مثلاً ہمشیرہ محمد علی، زوجہ احمد علی، والدہ افضل علی وغیرہ۔ لیکن بعد میں آنے والی خواتین قلم کاروں نے کھل کر تانیثی تشخص کے مسئلے کو پیش کیا۔ حالانکہ اس صدی کے دوران انہوں نے جو ادب تخلیق کیا اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ انہی تحریروں کی وجہ سے خواتین کو فہم و ادراک حاصل ہوا اور اس صدی کا ادب جدید اردو ادب کے ورثے میں بہت اہم اور باوقار اضافہ ہے۔

اس صدی کی ابتداء سے خواتین نے تعلیمی اور تخلیقی سرگرمیوں میں باقاعدہ حصہ لینا شروع کیا۔ اس دور میں محمدی بیگم خواتین کی تخلیقات پر مبنی رسالہ تہذیب نسواں نکال رہی تھیں۔ انہوں نے تعلیم نسواں کی تحریک کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہی کی کوششوں سے ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ میں لڑکیوں کا پہلا اسکول قائم ہوا۔

اسی طرح ۱۹۰۸ء میں خواتین کا رسالہ "عصمت" بھی منظرِ عام پر آیا جو ابتدائی اردو ادب میں خواتین کے حقوق و مسائل کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ ان ادبی جرائد میں خواتین کی تخلیقات اور ان کے فکر و شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان ادبی جرائد میں خواتین قلم کاروں میں نذر سجاد حیدر، صغریٰ ہمایوں، فاطمہ بیگم، بیگم اختر سہروردی، شائستہ اکرام اللہ جب کہ شاعرات میں رابعہ پنہاں، ز۔خ۔ش (زاہدہ خاتون شیروانیہ) صفیہ شمیم ملیح آبادی اور بلقیس جمال جیسی شاعرات شامل ہیں۔ جنہوں نے اپنے قلم کے زور سے اپنی آواز، خیالات، جذبات و کیفیات کو سماج تک پہنچایا اور خواتین میں شعور و آگہی کو بیدار کیا۔

ز۔خ۔ش (زاہدہ خاتون شیروانیہ):

ز۔خ۔ش (زاہدہ خاتون شیروانیہ) ایک باشعور اور تعلیم یافتہ شاعرہ تھیں۔ وہ تمام عمر اس بات کا اظہار کرتی رہیں کہ عورت کی راہیں بند کر دی گئی ہیں۔ انہیں خود بھی سیاسی و سماجی نظریات کی مکمل آزادی نہ تھی۔ سیاسی نظریات کے اظہار میں اپنے والد کی انگریز پرستی اور داخلی کیفیات کے بیان میں خاندانی روایات حائل رہیں۔ اپنی ایک نظم "عالم نسواں کا انقلاب" میں لکھتی ہیں:

عورتوں کے حق میں ہر مذہب کا ہر ملت کا فرد جانور تھا، دیوتا، عفریت تھا، شیطان تھا، باپ ہو، بھائی ہو،
شوہر ہو کہ ہو فرزند وہ مرد کل اشکار میں فرعون بے سامان تھا مرد کی ناآشنا نظروں میں عورت کا وجود
اک مورت، اک کھلونا، ایک تن بے جان تھا۔[۱۴]

اسی طرح وہ عورت کو معاشرتی صورت حال سے آگاہ رہنے اور اپنے حقوق و مسائل کے لیے متحرک ہونے کی دعوت دیتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

نہ آئے گی نہ آئے گی نظر صورت ترقی کی
نہ ہوں گے ہم جو میدان عمل میں رونما بہنو

اسی طرح باقی دیگر شاعرات وادیبات کی تحریروں اور کلام میں نسائی شعور اور نسائی اظہار نمایاں نظر آتا ہے۔ انہوں نے خواتین کے سماجی مسائل اور حقوق کو موضوع بنا کر تانیثی فکر اور نظریے کو پروان چڑھایا اور نسائی ادب کو فروغ دیا۔

خواتین کی شناخت، سماجی و سیاسی مرتبہ، استحصال، صنفی امتیاز، عدم مساوات اور محکومی و محرومی وغیرہ ایسے ممنوعہ موضوعات تھے جو اس دور کی خواتین قلم کاروں کے لیے ایک چیلنج بن چکے تھے لیکن ان موضوعات پر قلم کاری کر کے ان ادیباؤں نے سماج کے لیے فہم وادراک کے در وا کر دیئے۔ ان میں سے چند شاعرات وادیبات کے نام درج ذیل ہیں۔

رشید جہاں، عصمت چغتائی، خورشید بانو، رابعہ پنہاں، بلقیس جمال، مہ لقا بائی چندا، ادا جعفری، صالحہ عابد حسین، ترنم ریاض، سارہ شگفتہ، ساجدہ زیدی، قرۃ العین حیدر، جمیلہ ہاشمی، جیلانی بانو، رفیعہ شبنم عابدی، شہناز نبی، بانو قدسیہ، فرخندہ لودھی، رضیہ فصیح احمد، صغرا ہمایوں مرزا، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، ممتاز شیریں وغیرہ ایسی تخلیق کار ہیں جنہوں نے خواتین کے مسائل پر عالمانہ نظر ڈالی اور تانیثی فکر کو مرکزی موضوع بنایا جو کہ نسائی کردار کی عکاسی،

حقوق کی پامالی اور جبر و استحصال کے خلاف ایک تحریک ہے۔ اردو ادب کی ابتدائی دور کی خواتین قلم کاروں کا بنیادی مقصد خواتین کی سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، خانگی، ثقافتی، مذہبی اور تعلیمی مسائل کی شعوری سطح پر بیداری پیدا ہو سکے تاکہ کوئی یہ کہنے کے قابل نہ ہو کہ:

اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو
جواب کیے ہو داتا ایسا نہ کیجو!

اردو شعری ادب میں تانیثی رجحان:

بیسویں صدی میں اردو ادب میں تانیثی رجحانات بالکل واضح طور پر ابھر کر سامنے آ گئے۔ اردو ادب میں نسائی شناخت کے نقوش دکھائی دیتے ہیں۔ خواتین قلم کاروں کے تجربات، رد عمل اور نفسیات ایک نئے لب و لہجے اور اسلوب میں قارئین کے سامنے آ رہے ہیں۔

بیسویں صدی میں اردو ادب میں جو تانیثی رجحان ملتا ہے، اسے تانیثی تحریک کی تیسری لہر کہا جاتا ہے جو کہ جدید تانیثیت کہلاتی ہے۔ جدید تانیثیت کی تحریک سے وابستہ عورت ادعائیت کی حامل ہے یعنی اس میں جذبہ، ارادہ اور ادراک شعور انسانی کے پہلو موجود ہیں۔ تانیثی تحریک سے متاثر خواتین باشعور اور طاقت ور ہیں اور اپنی جنسیت پر انہیں خود اختیار ہے۔ جدید تانیثی تحریک عورت کی معاشی و سیاسی اور سماجی مختاریت کے ساتھ ساتھ اس کی انفرادی مختاریت پر بھی اپنی توجہ مرکوز کرتی ہے۔ اس تحریک کے دوران عورت کا تشخص ابھر کر سامنے آیا ہے۔

اردو ادب میں تانیثی رجحانات، خواتین قلم کاروں کی تخلیقات میں بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے ہی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ان کی تخلیقات تانیثی رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔ تانیثی زبان، اسلوب اور جملوں کی شناخت کا آغاز تو رشید جہاں اور عصمت چغتائی کے دور سے شروع ہوا تھا۔ اس دور کی خواتین قلم کاروں کی تخلیقات میں خیالات و جذبات کا اظہار نہ صرف ایک نئی نسائی شناخت اور نسائی خود آگہی کا پتہ دیتی ہیں بلکہ سماج کے وضع کردہ اصولوں اور روایات کے خلاف بھی ابھارتی ہیں۔ اردو ادب میں تانیثیت کے موضوع پر گذشتہ تین دہائیوں سے مکالمہ جاری ہے۔ بیسویں صدی میں جہاں ہر شخص اپنے مفاد اور حصول حق کے لیے زمانے کے ساتھ نبرد آزما تھا وہیں خواتین نے بھی اپنے حقوق کے حصول کے لیے تحریک تانیثیت کے پلیٹ فارم پر مجتمع ہو کر اپنے حقوق کی خاطر صدائے احتجاج بلند کیا۔

اردو ادب میں مختلف ادبی تحریکات، رجحانات اور نظریات کی طرح تانیثیت نے بھی نظم و نثر میں اپنی ایک ایسی منفرد شناخت قائم کرلی ہے جسے اب نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اپنے انداز فکر اور لب ولہجہ کی بدولت اردو ادب میں تانیثیت اب اس مرحلے میں داخل ہو چکی ہے کہ نسائی ادب کے بغیر کوئی بھی ادبی تاریخ مکمل قرار نہیں پاسکتی۔

جدید اردو ادب میں تانیثیت کا وجود ہر صنفِ ادب میں ملتا ہے۔ بہت سی باصلاحیت خواتین نے فروغ علم و ادب میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ خواتین نے نہ صرف ناول نگاری میں اپنا سکہ جمایا بلکہ صحافت، شاعری، سیاست اور ادب لطیف جیسے شعبوں میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور اپنی فکری جہات کی چھاپ چھوڑی۔ ادب میں انقلابات رونما ہونے کے ساتھ ساتھ خواتین نے بھی اپنی ذہانت، ذمہ داری اور جانفشانی کا ثبوت فراہم کیا اور ہر فکری و علمی موضوع کو اپنی فکری ترجیحات کا مرکز و محور بنایا۔

اردو ادب میں نظم و نثر دونوں ہی سطحوں پر خواتین قلم کاروں نے مختلف تخلیقات کے ذریعے اپنی شناخت قائم کرتے ہوئے معاشرے کے شعور و آگہی کے رستے ہموار کیے۔ ابتدائی اردو ادب سے لے کر جدید اردو ادب تک جتنی بھی شاعرات و ادیبات ہیں، ان کی تمام تخلیقات تانیثی فکر و شعور کی وجہ سے اہمیت کی حامل ہیں۔

بیسویں صدی میں تانیثی / نسائی تحریک اپنے عروج پر تھی اور اس تحریک کے اثرات بیسویں اور اکیسویں صدی کی تخلیقات پر بھی مرتب نظر آتے ہیں۔ خواتین شاعرات و ادیبات نے اپنی تحریروں اور کلام میں اپنے جذبات و خیالات کا کھل کر اظہار کیا۔ ان کے تجربات، ردّ عمل اور نفسیات ایک نئے لب و لہجے اور اسلوب میں ہمارے سامنے آرہے ہیں۔

فہمیدہ ریاض:

موجودہ دور کی شاعرات و ادیبات میں تانیثی لب ولہجہ اور تانیثی زاویۂ نظر سے فہمیدہ ریاض کی ایک منفرد آواز ہے۔ ان کی شاعری بادی النظر میں ایک سنجیدہ اور متین انداز میں ان کے اپنے داخلی جذبات و احساسات کی آئینہ دار ہے۔ وہ بڑی بے باکی سے اقدار، مفروضوں اور رائج الوقت علم و دانش کو فرسودہ قرار دیتی ہیں اور اسے چیلنج کرکے، نابود کرنے کی تلقین کرتی ہیں:

یہ سچ ہے مرے فلسفی
میرے شاعر

وہ وقت آ گیا ہے

کہ دنیا کے بوڑھے فریبی معلم کا جبّہ پکڑ کر

نئے لوگ کہہ دیں

کتابیں بدل دو

یہ جھوٹی کتابیں

جو ہم کو پڑھاتے چلے آ رہے ہیں

حقیقت کے رخ سے

یہ معنیٔ فرسودہ لفظوں کے پردے ہٹا دو

جلا دو

کتابیں جو ہم نے پڑھی ہیں [15]

فہمیدہ ریاض تانیثی شاعری کا ایک معتبر حوالہ ہیں۔ اگر ان کی شاعری کو نسائی جذبوں کا مزاحمتی بیانیہ کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہو گا۔ ان کے ارتقائے حیات و فن کو دیکھا جائے تو ان کی شاعری کی معنویت اور ایک عورت کے جرأت مندانہ اظہار کے راز عیاں ہوتے ہیں۔ اپنی نظم "چادر اور چار دیواری" میں لکھتی ہیں کہ:

حضور میں اس سیاہ چادر کا کیا کروں گی

یہ آپ کیوں مجھ کو بخشتے ہیں بصد عنایت

نہ سوگ میں ہوں کہ اس کو اوڑھوں

غم و الم خلق کو دکھاؤں

نہ روگ میں ہوں کہ اس کی تاریکیوں میں خفت سے ڈوب جاؤں

نہ میں گناہ گار ہوں نہ مجرم

کہ اس سیاہی کی مہر اپنی جبیں پہ ہر حال میں لگاؤں [16]

فہمیدہ ریاض شاعری کے ساتھ ساتھ خواتین کے استحصال اور معاشرتی جبر و قیود کے خلاف بھی عملی طور پر سرگرم رہیں۔ ان کی شاعری میں جہاں عورت کے لطیف اور کومل جذبات و احساسات کا بیان ملتا ہے وہیں مذہبی و معاشرتی بندشوں میں جکڑی عورت کا مزاحمتی نوحہ بھی سنائی دیتا ہے۔

معاشرتی بندشوں اور مردوں کی صنفی برتری والے نظام میں گھٹن زدہ زندگی گزارنے کی بجائے فہمیدہ ریاض مزاحمت کی نمائندہ آواز بنیں۔ جس نے نہ صرف خود اپنے خیالات بلکہ اپنے معاشرے کی عورت کے احساسات کو اظہار دیا۔ ان کی شاعری میں دور جدید کی عورت کے اندر اٹھتی خود مختاری اور روایت شکنی کی خواہش کا اظہار واضح ہے۔ وہ ایک ایسی عورت کی خواہش کو اپنی شاعری کے ذریعے ظاہر کرتی دکھائی دیتی ہیں جو سنگ دل رواجوں کے خستہ حال زندان سے فرار پاکر رقص رندانہ کی مستی سے آزادانہ سرشاری چاہتی ہے۔ اپنی نظم "ایک لڑکی سی" میں لکھتی ہیں کہ:

یہ اسیر شہزادی۔۔۔!
جبر وخوف کی دختر
واہموں کی پروردہ
مصلحت سے ہم بستر
ضعف ویاس کی مادر
جب نجات پائے گی
سانس لے گی درّانہ
محوِ رقص رندانہ
اپنی ذات پائے گی[۱۷]

فہمیدہ ریاض کی تمام شاعری میں ایسے ہی کہیں عورت کے لطیف نسوانی جذبات کی عکاسی ہے تو کہیں معاشرے میں عورت کے استحصال کے خلاف رد عمل کے طور پر واضح اور بے باک مزاحمت ہے۔

تانیثیت کو فہمیدہ ریاض نے ایک ایسی مثبت سوچ، مدبرانہ تجزیہ اور دانش ورانہ اسلوب سے تعبیر کیا ہے جس کے اہداف میں خواتین کے لیے معاشرے میں ترقی کے منصفانہ اور یکساں مواقع کی فراہمی کو یقینی بنانے کا واضح لائحہ عمل متعین کیا گیا ہو۔ معاشرے میں خواتین کے لیے ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ خواتین کسی قسم کے خوف وہراس کے بغیر کاروانِ ہستی کے تیز گام قافلے میں مردوں کے شانہ بشانہ اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔ روشنی کے اس سفر میں خواتین کو استحصالی عناصر سے آگاہ کرنا تانیثیت کا اہم موضوع رہا ہے۔ ایک فلاحی معاشرے میں اس بات کا خیال رکھا

جاتا ہے کہ معاشرے کے تمام افراد کو ہر قسم کا معاشرتی تحفظ فراہم کیا جائے کیونکہ ہر فرد کو ملت کے مقدر کے ستارے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

تانیثیت نے حق وانصاف کی بالادستی، حریت فکر، آزادئ اظہار اور معاشرے کو ہر قسم کے استحصال سے پاک کرنے پر اصرار کیا۔ فہمیدہ ریاض کے نزدیک تانیثیت کے امتیازی پہلو یہ ہیں کہ اس میں زندگی کی سماجی، ثقافتی، معاشرتی، سیاسی، عمرانی اور ہر قسم کی تخلیقی اقدار و روایات کو جلا دینے اور انہیں مثبت انداز میں بروئے کار لانے کی راہ دکھائی جاتی ہے اور اس تحریک کے ذریعے خواتین کی صلاحیتوں کو نکھارنے کے مواقع کی جستجو پر توجہ مرکوز رہتی ہے۔

کشور ناہید:

اردو ادب میں کشور ناہید سے قبل اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والی خواتین کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن میں رشید جہاں، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر وغیرہ شامل ہیں۔ مگر جدید دور میں دو خواتین کا لب ولہجہ بہت منفرد نوعیت کا حامل رہا ہے اور وہ دو خواتین کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض ہیں۔

کشور ناہید نے اپنی شاعری میں واضح طور پر نسائی شعور کی نشاندہی کی اور اس شعور کو معاشرے میں متعارف کروانے میں ایک مؤثر کردار ادا کیا۔ انہوں نے نہ صرف تانیثی شعور کے رجحان کو تخلیقی شکل دی بلکہ مغرب کے نسائی ادب پاروں کا ترجمہ بھی کیا۔ انہوں نے نسائی ادب میں ایک اہم نام سیمون دی بوائر کی شہرہ آفاق تصنیف *The Second Sex* سے ماخوذ ایک کتاب "عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک" مرتب کی۔ اس کتاب کا ترجمہ و تلخیص کرنے کے بعد انہوں نے اس میں عورت کی نفسیاتی گرہ کو کھولنے کے لیے اپنے سماج کی مثالیں شامل کیں کیونکہ جدید دور کا معاشرتی نظام مغرب کے معاشرے سے بہت مختلف ہے اور یہاں کے نسائی مسائل کو اسی معاشرے کی صورت حال کے مطابق حل کیا جا سکتا ہے کیونکہ مشرق و مغرب کے معاشرتی نظام اور سماج کے پیدا شدہ مسائل کی نوعیت مختلف ہے۔

تانیثیت جو کہ عورت کے تبسم سے اس کے آنسوؤں تک سب معاملات سے متعلق ایک عالمی تحریک بن چکی ہے اور دنیا بھر میں نسائی حقوق اسی فکری تحریک سے جڑ گئے ہیں جو مرد و عورت کے رشتے کو انسانی سطح پر اور برابری کی سطح پر از سرِ نو مرتب کر رہی ہے۔

کشور ناہید کی شاعری تانیثی شعور کے حوالے سے بہت اہم ہے کیونکہ ان کی شاعری میں کسی عام عورت کی

نہیں بلکہ اس عورت کی شاعری ہے جسے عورت کے حقوق کا علم ہے اور وہ ان حقوق کی حق تلفی پر آواز اٹھاتی ہے۔

"سوختہ سامانی دل" کی کئی نثری نظموں میں کشور ناہید اپنا احتجاج بیان کرتی ہیں کہ وہ عورت کی روایتی کوکھ کو تقدیر یا قسمت کے حوالے نہیں کرتیں بلکہ وہ عورت پر ہونے والے ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھاتی ہیں۔ وہ اپنی نظم "میں اسے منع نہیں کر سکتی ہوں" میں یوں گویا ہوتی ہیں:

مجھے اپنی کوکھ سے کبھی محبت نہیں رہی
محبت تو تب ہوتی
جب اس کوکھ کو بھر دینے والوں نے
کبھی بھروسے اور محبت کا یقین دلایا ہوتا
جیسے لاتیں، گھونسے کھا کر بھی
سال بہ سال عورتیں بچے جنے جاتی ہیں
میں بھی ویسی ہی تھی
میری کھال سنگترے کے چھلکے کی طرح
ادھیڑ دی جاتی
پھر بھی میں سال بہ سال بچے جنے جاتی
میں شاید ابوالہول کے زمانے کی
ریت میں دھنسی عورت تھی

کشور ناہید نے براہِ راست عورت کے جذبات و مسائل کو موضوع سخن بنایا اور پورے شعور و ادراک کے ساتھ اپنی شاعری میں ان سماجی رویّوں پر احتجاج کیا جن کا شکار خواتین تھیں۔ ان کی شاعری میں مزاحمتی انداز نظر آتا ہے جیسے کہ وہ اپنی ایک نظم میں یوں رقم طراز ہوتی ہیں:

ہم گنہگار عورتیں ہیں
جو اہل جبّہ کی تمکنت سے نہ رعب کھائیں
نہ جان بیچیں
نہ سر جھکائیں

نہ ہاتھ جوڑیں

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں

کہ جن کے جسموں کی فصل بیچیں جو لوگ

وہ سرفراز ٹھریں

نیابت امتیاز ٹھریں

وہ داورِ اہل ساز ٹھریں

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں

کہ سچ کا پرچم اٹھا کے نکلیں

تو جھوٹ سے شاہراہیں اٹی ملے ہیں

ہر ایک دہلیز پہ سزاؤں کی داستانیں رکھی ملے ہیں

جو بول سکتی تھیں وہ زبانیں کٹی ملے ہیں

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں

کہ اب تعاقب میں رات بھی آئے

تو یہ آنکھیں نہیں بجھیں گی

کہ اب جو دیوار گر چکی ہے

اسے اٹھانے کی ضد نہ کرنا

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں

جو اہل جبّہ کی تمکنت سے رعب نہ کھائیں

نہ جان بیچیں

نہ سر جھکائیں

نہ ہاتھ جوڑیں

(کشور ناہید)

کشور ناہید کی شاعری میں خصوصاً نثری نظموں میں نسائی شعور اور معاشرے کے تلخ حقائق ابھر کر سامنے آتے ہیں جن سے عصر حاضر کی خواتین دوچار ہیں۔ اگر نثری نظم میں تانیثی اثرات کا جائزہ لیا جائے تو اردو ادب میں بہت سی شاعرات ایسی ملتی ہیں جنہوں نے نسائی شعور کو مزید وسعت دی۔ مثال کے طور پر عذرا عباس، نسرین انجم بھٹی، سیما خان اور کرزئی، شائستہ حبیب، تنویر انجم، فہمیدہ ریاض، سارا شگفتہ اور کشور ناہید وغیرہ۔ ان تمام شاعرات کو نثری نظم کی صورت میں تخلیقی اظہار کے لیے ایسا کینوس ملا جو نئے رویئے سے ہم آہنگ ہے۔

کشور ناہید کی شاعری تانیثی شعور سے بھری پڑی ہے کیونکہ وہ بخوبی آگاہ ہیں کہ جبر کا شکار ہو کر بھی صرف عورت ہی معاشرتی ناہمواریوں پہ نوحہ کناں ہے۔ اسی حوالے سے وہ "سوختہ سامانی دل" میں لکھتی ہیں کہ:

میں ایک ہاتھ سے دیوار کیسے تھاموں گی
لہو میں غرق ہے دست دعا نیام تلک

وہ عصرِ حاضر کی عورت کو اپنی شاعری کے ذریعے اس بات کا شعور دلاتی ہیں کہ تم بھی اس سماج کا ایک جیتا جاگتا فرد ہو۔ اپنے حق کے لیے اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرو۔ یہی وجہ ہے کہ کشور ناہید کے ہاں احتجاج زیادہ گہرا جذباتی اور فنی مضبوطی کے ساتھ ملتا ہے۔

چونکہ اردو نظم میں عورت اپنی شناخت کی گمشدگی پر احتجاج کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو تانیثی نظموں کا غالب رجحان مرد اور سماج کے خلاف احتجاج کرنے کی طرف ملتا ہے۔ اس ضمن میں کشور ناہید یوں رقم طراز ہوتی ہیں:

ستم شناس ہوں لیکن زبان بریدہ ہوں
میں اپنی پیاس کی تصویر بن کے زندہ ہوں
زباں ہے قزمزی، حدت سے میرے سینے کی
میں مثل سنگ چخ کے بھی سنگ خوردہ ہوں

کشور ناہید کی نظموں میں عورت کے سماجی مرتبے اور بنیادی حقوق کے تحفظ کا احساس ملتا ہے۔ وہ ناچاہتے ہوئے بھی عورت کو اپنے خطے کے مجموعی سماجی تناظر میں دیکھتی ہیں۔ ان کی نظمیں تانیثی مرحلے کی بازیافت ہیں۔ اخلاقی اور سماجی، بے توقیری، ونی کی رسمیں، سماجی بندھن اور مرد حاکمیت کی خلاف شدید احتجاج کشور ناہید کی نظموں کا بنیادی محرک ہے۔

انیسویں صدی کے اختتام تک عورتوں کے حقوق کی آواز نے بڑی تیزی سے تحریک کی شکل اختیار کی اور اس ضمن میں خواتین کی کئی عسکری تنظیمیں بھی منظرِ عام پر آئیں جنہوں نے خواتین کے مسائل کو کھل کر بیان کیا۔ ان تمام کاوشوں کے نتیجے میں بیسویں صدی تک آتے آتے عورتوں پر ملازمتوں کے دروازے بھی کھل گئے اور گھٹن زدہ ماحول میں رہنے والی عورت نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنی اہمیت اور ضرورت کو تسلیم کروالیا۔ اس ساری صورت حال کو کشور ناہید اپنی نظم "اکیسویں صدی کا زمزمہ" میں یوں بیان کرتی ہیں:

میں سوال کرتی ہوں
اپنے جیسے انسان سے
کب یہ مرتبت دو گے
کب برا نہ مانو گے
میرے ساتھ چلنے پہ
میرے شخص ہونے پہ
میرے خواب بننے پہ
سوچنے پہ ہنسنے پہ

یہ صدی جو بیتی ہے
وہ صدی تمہاری تھی
یہ صدی جو آئے گی
وہ صدی ہماری ہے **(سوختہ سامانی دل)**

پروین شاکر:

پچھلی تین، چار دہائیوں سے اردو شاعری کے میدان میں جن خواتین شاعرات نے اہم کردار ادا کیا، ان میں سے ایک نمایاں نام پروین شاکر کا بھی ہے۔ جنہوں نے تانیثی شاعری کے حوالے سے اپنی ایک الگ شناخت بنائی اور خواتین کی نئی نسل کی نمائندہ بن کر ان کی رہبری کی۔ انہوں نے موضوعات کی رنگارنگی، اسلوب و تجربات کی ندرت اور نسائی جذبوں کو اپنے مخصوص لہجے میں شاعرانہ پیکر میں ڈھال کر تانیثی شاعری میں ایک امتیاز حاصل کیا۔

پروین شاکر کا نام اردو شاعری کے حوالے سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے ان لہروں کو محسوس کیا جو مغرب سے مشرق کی طرف آ رہی تھیں اور اس میں نسائی شعور کی لہر سب سے زیادہ طاقت ور تھی۔ ان کی شاعری میں ان لطیف جذبات اور مخصوص کیفیات کا اظہار ملتا ہے جو عورت کی شخصیت سے عبارت ہے۔

ان کی وہ نظمیں جو تانیثی جذبات و احساسات کی حامل ہیں ان میں گیلے بالوں سے چھنا سورج، ورکنگ وومن، سجدہ، بے پناہی، سالگرہ، صرف ایک لڑکی، ایک دفنائی ہوئی آواز اور لیڈی آف دی ہاؤس وغیرہ کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان نظموں کے علاوہ بھی بہت سی نظمیں ہیں جن میں نسائی شعور اور تانیثی لب و لہجہ موجود ہے۔ اپنی ایک نظم "گیلے بالوں سے چھنا سورج" میں لکھتی ہیں:

شوخ کرن نے
گیلے ریشم بالوں کو جس لمحہ چھوا
بے ساختہ ہنس دی
پلکوں تک آتے آتے
سورج کی ہنسی بھی
گوری کی مسکان کی صورت
سات رنگ میں بھیگ چکی تھی!

پروین شاکر کی شاعری میں عورت کی خوشیاں، اس کے دکھ سکھ، جذبات، احساسات، علامتوں، تشبیہات اور استعارات کی شکل میں اظہار پاتے موجود ہیں۔ ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ "خوشبو" نسائی جذبات سے بھرپور ہے۔ ان کے اس شاعری مجموعے میں نوعمر لڑکیوں کی نفسیات اور جذباتی کیفیات کی واضح عکاسی ملتی ہے۔ اس مجموعے میں شامل تمام نظمیں احتیاط، اعتراف، کشف، گماں، پیار، پہلے پہل اور کانچ کی سرخ چوڑی وغیرہ ان کے خیالات کی آئینہ دار ہیں۔

پروین شاکر کی شاعری میں ہر طبقے کی عورت اپنے ذہنی و جذباتی رویوں سمیت جلوہ گر ہے۔ چاہے مزدور پیشہ عورت ہو یا اعلیٰ سوسائٹی سے تعلق رکھنے والی عورت، تمام عورتوں کے اپنے مسائل اور المیے ہیں جن کا وہ حل چاہتی ہیں۔ مرد اساس معاشرے میں عورت کو کمزور سمجھ کر اس پر ہونے والے ظلم اور ناانصافی جیسے موضوعات پر تفصیلی اظہارِ خیال ملتا ہے۔ اس حوالے سے پروین شاکر اپنی نظم صرف ایک لڑکی میں یوں رقم طراز ہوتی ہیں:

اپنے سرد کمرے میں

میں اداس بیٹھی ہوں
نیم وادر یچوں سے
نم ہوائیں آتی ہیں
میرے جسم کو چھو کر
آگ سی لگاتی ہیں
تیرا نام لے لے کر
مجھ کو گدگداتی ہیں
کاش میرے پر ہوتے
تیرے پاس اڑ آتی
کاش میں ہوا ہوتی
تجھ کو چھو کر لوٹ آتی
میں نہیں مگر کچھ بھی
سنگ دل رواجوں کے
آہنی حصاروں میں
عمر قید کی ملزم
صرف ایک لڑکی ہوں!

تانیثی نظریات کے تناظر میں مردوں کی بالا دستی سے انحراف، نفرت، روایتوں سے بغاوت اور مرد کے خلاف اعلانِ جنگ جیسے شدید رویوں کے برعکس پروین شاکر نے نسائی احساسات وادراک کی ترجمانی کے ساتھ احترامِ نسواں کے تصور کو لطیف پیرائے میں شاعرانہ نزاکت اور تہذیب کے ساتھ پیش کر کے تانیثیت نگاری کے نئے اسلوب کی ترجمانی کی بنیاد رکھی ہے۔

میں اس کی دسترس میں ہوں مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے

اردو نثری ادب میں تانیثی رجحان:

ادب کا تانیثی مطالعہ احتجاج و نعرے بازی کے بجائے حق اور انصاف دینے کا نام ہے جو پدری سماج کے اصولوں کا خاتمہ کر کے ایک نئے معاشرے کی تشکیل کرتی ہے۔ اردو ادب میں تانیثی تحریک کا بنیادی نظریہ عورت کو بحیثیت انسان تسلیم کروانا ہے۔ عورت کو کسی ایک دائرے تک محدود نہ رکھ کر اس کو مختلف شعبہ ہائے زندگی میں عزت و احترام کے ساتھ اس کو وہ تمام حقوق دیئے جائیں جن کی دین اسلام نے عورت کو مستحق قرار دیا ہے۔ اردو ادب میں یہ تحریک تانیثیت کے نام سے جانی جاتی ہے جو خصوصاً عورتوں کے مسائل سے متعلق ہے۔ یہ تحریک صدیوں سے خواتین کے ساتھ ہوتی ناانصافی، حقوق کی تلفی اور استحصال کے خلاف علم احتجاج بلند کرتی چلی آرہی ہے۔ جس کی جھلک اردو ادب کے ابتدائی دور میں پہلی خاتون ناول نگار رشیدہ النساء کے ناول "اصلاح النساء" اور پہلی خاتون شاعرہ ماہ لقابائی کی شاعری اور اس کے علاوہ رشید جہاں، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، بیگم نذر سجاد حیدر، صدیقہ بیگم، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، جمیلہ ہاشمی، الطاف فاطمہ، رضیہ فصیح، نثار عزیز بٹ، فرخندہ لودھی اور خالدہ حسین وغیرہ کی تخلیقات میں واضح طور پر تانیثی اثرات نظر آتے ہیں۔

اردو افسانے میں تانیثی رجحان کی اولین محرک اور احتجاج و مزاحمت کی آواز بلند کرنے والی پہلی خاتون افسانہ نگار ڈاکٹر رشید جہاں نظر آتی ہیں جنہوں نے اپنے افسانوں سے نہ صرف قدامت پرستی اور توہم پرستی پر ضرب لگائی بلکہ ادبی سطح پر بھی نئے معیار اور نئی قدروں کو جنم دیا۔

اردو ناول نگاری اور افسانہ نگاری میں عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر جیسی باہمت ادیباؤں نے خواتین قلم کاروں کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ انہوں نے بہت بے باکی کے ساتھ عورتوں کے مسائل کو اجاگر کیا اور مردانہ معاشرے میں عورتوں کو ان کی اہمیت و مرتبہ اور ان کے حقوق کے لیے آواز بلند کی۔

عصمت چغتائی:

عصمت چغتائی کے افسانے اور ناولٹ ایک تانیثی ذہن، تانیثی شعور اور تانیثی ادراک کی سمتوں کا پتہ دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں تانیثیت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ انہوں نے متوسط طبقے کے مسلمان گھرانوں کی لڑکیوں کو خصوصاً اپنے ناولوں کا حصہ بنایا اور ان کے جذباتی و جنسی پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ عورت کے احساسات و جذبات، سماج میں اس کی حیثیت اور نفسیات وغیرہ کو بہت خوب صورتی سے پہلی بار کوئی خاتون قلم کار الفاظ کے سانچے میں ڈھال کر منظرِ عام پر لے کر آئی۔ اردو نثری ادب میں تانیثیت کی سب سے پہلی واضح آواز عصمت چغتائی کی ہے۔ ان کا لب ولہجہ، آہنگ، اندازِ تحریر خالص تانیثی ہے۔ خواتین اردو ادب میں ان کی تحریریں تانیثی

حسیت اور تانیثی شعور کے اظہار کا پہلا تجربہ ہیں۔ ان کے موضوعات منفرد ہیں۔ سماجی حالات پر ان کا ردعمل بھی جداگانہ ہے۔ عورت کے جذبات، کیفیات، عورت کے سماجی حالات کی عکس بندی، ان کا نفسیاتی رد عمل، نسائی اردو ادب میں ایک نیا تجربہ ہیں۔

عصمت چغتائی کا ناول "ٹیڑھی لکیر" اور افسانہ "لحاف" نسائی اظہار کی بہت واضح مثال ہے۔ ناول ٹیڑھی لکیر میں انہوں نے بہت جرأت سے اس نسائی شعور کا اظہار کیا ہے جو اس وقت تک نظرانداز ہوتا رہا ہے۔ یہ ناول تانیثی اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے تمام معاشرتی برائیوں اور مسائل کو عورت کے ذریعے پیش کیا۔

بقول اے۔ رحمٰن ثاقب:

> عورت اور مرد ہیں۔ کا نعرہ بیسویں صدی کی ابتدا میں شدت اختیار کر چکا تھا۔ اس کو فنی جامہ پہنانے والی ادیباؤں میں عصمت آگے رہی ہیں اور اپنی تحریروں، ہر مقام اور منزل سے عورت کی مساویت کی پُرجوش حمایت کرتی رہی ہیں۔[18]

عصمت چغتائی مردوں اور عورتوں کے سلسلے میں دو متضاد سماجی اقدار اور رویوں کو فنکارانہ انداز میں یوں اجاگر کرتی ہیں:

> وہ ایک کمزور عورت ہوتے ہوئے بھی اپاہج اور مجبور نہیں تھیں۔ مردوں کے تمام حقوق انہیں حاصل تھے۔ رات برات اکیلی جہاں چاہتیں، اونچی آواز سے اعلان عشق کر دیتیں اور اونچی آواز سے الاپتیں۔ آوازے کستیں، دھڑ سے گالی بک دیتیں۔ مردوں کے ساتھ بیٹھ کر قوالی سنتیں اور چھن چھن روپے پھینکتیں۔[19]

درحقیقت "دل کی دنیا" ناولٹ موضوع کے اعتبار سے جتنا حساس اور خطرناک آج سے ساٹھ برس پیشتر تھا، اتنا ہی آج بھی ہے۔ کیونکہ اس ناولٹ میں عصمت کے وہ تمام خیالات اور نظریات یکجا ہو گئے ہیں جن پر وہ تادم آخر قائم رہیں۔ مثلاً جنسی ناآسودگی اور اس کے حصول کے لیے جرأت مندانہ اقدام خواہ وہ دنیا کی نظر میں جائز ہو یا ناجائز، توہم پرستی، عورتوں اور مردوں کے درمیان سماجی نابرابری، معاشرے میں پھیلے بے جا رسم و رواج سے بغاوت، گھریلوں عورتوں کی بے بسی اور مجبوری وغیرہ غرض کہ ان کے نظریات کی مکمل عکاسی "دل کی دنیا" میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔

بقول ڈاکٹر زرینہ عقیل احمد:

> اس ناول (دل کی دنیا) میں عورت نے نئی زندگی اور نئی قدروں کا خیر مقدم کیا ہے۔ سماجی ناانصافی کے

خلاف بغاوت کی ہے۔ فرسودہ خاندانی روایات کو بے جگری کے ساتھ توڑا ہے۔۔۔۔۔ انسان کو اپنی صلاحیتوں سے، اپنی جدوجہد اور محنت سے اپنی دنیا آپ پیدا کرنی چاہیے۔[20]

غرض یہ کہ عصمت چغتائی نے اپنی تخلیقات میں خواتین سے متعلق تمام مسائل پر بہت مؤثر انداز میں اپنے رد عمل کا اظہار کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں عورتوں کے مسائل کی سچی اور حقیقی تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔ انہوں نے زندگی کو جس انداز میں دیکھا، اسی انداز میں پیش بھی کیا اور عورت کا نمایاں روپ دکھانے کی کوشش کی۔ ان کی تحریروں میں عورت کا استحصال اور اس پر ہونے والے ظلم کے خلاف شدید احتجاج ملتا ہے۔ انہوں نے عورت کے احساسات، جذبات اور سماج میں اس کی حیثیت اور عکس بندی کو پہلی بار اردو ادب میں جگہ دی۔

بقول ترنم ریاض:

> عصمت چغتائی کا لب و لہجہ، ان کا آہنگ، ان کا اندازِ تحریر خالص تانیثی ہے۔ خواتین اردو ادب میں ان کی تحریریں تانیثی حسیّت اور تانیثی شعور کے اظہار کا پہلا تجربہ ہیں۔ عصمت کے موضوعات منفرد ہیں۔ سماجی حالات پر ان کا رد عمل بھی جداگانہ ہے۔ ان کے لہجے میں کوئی بناوٹ یا سجاوٹ نظر نہیں آتی۔[21]

عصمت چغتائی اردو ادب کی واحد ایسی خاتون افسانہ نگار ہیں جنہوں نے مسئلہ تانیثیت کو بڑی مضبوطی کے ساتھ پیش کیا اور عورت کو صرف حسن و عشق اور محبت و رومان کی چیز نہیں سمجھا بلکہ اس کی خصوصیات کو بیان کر کے اس کو اپنی اہمیت کا احساس دلانے کی کشش کی تاکہ اسے سماج میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔

قرۃ العین حیدر:

قرۃ العین حیدر نے سماجیاتی، ثقافتی اور سیاسی و فلسفیانہ پس منظر میں اپنی تخلیقات رقم کیں۔ ان تخلیقات نے خود بینی اور جہاں بینی کی بہترین عکاسی کی ہے۔ انہوں نے تانیثی فکر کو موضوع بنایا اور خواتین کو اپنی تحریروں میں ذہین، جذباتی اور طاقت ور بنا کر پیش کیا جو معاشرتی سطح پر مردوں کے قدم سے قدم ملا کر چل سکتی ہو۔ ایسی باشعور صاحب رائے عورت کا تصور پیش کیا جو عالمی سطح پر ادبی و تاریخی نظر رکھتی ہو۔ گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ بھی سہتی ہو اور فرسودہ روایتوں کو توڑ کر خود مختاری کا اعلان بھی کرتی ہو۔ ایسے بہادر کردار کو منظرِ عام پر لائیں۔

قرۃ العین حیدر ایک ممتاز حیثیت رکھنے والی خاتون قلم کار ہیں۔ ان کی شہرت زیادہ تر تکنیک کے سبب ہے جسے شعور کی رو کہا جاتا ہے۔ اسی لیے ان کا ادبی کینوس نہایت وسیع ہے۔ ان کا ناول "آگ کا دریا" ایک ایسا ناول ہے جو پوسٹ ماڈرن فیمنسٹ نقادوں کے مطابق عورت کے تصور وقت کی مثال پیش کرتا ہے۔ ان کے ناولوں اور افسانوں میں نسائی شعور کا مکمل ادراک و اظہار ملتا ہے۔ ان کے مقبول و معروف ناولوں میں میرے بھی صنم خانے،

سفینۂ غمِ دل، آگ کا دریا، آخر شب کے ہم سفر، کارِ جہاں دراز ہے، گردشِ رنگِ چمن اور چاندنی بیگم میں عورت کے کئی روپ ظاہر ہوتے ہیں۔ اپنے افسانے یادوں کی اک دھنک جلے میں یوں رقم طراز ہوتی ہیں:

> ازل سے اب تک عورت ہی وہ مخلوق ہے جس کی قسمت میں ساری بدنصیبیاں لکھی ہوئی ہیں۔ یہ عورت ہی ہے جو ساری عمر مرد کی مختلف قسموں سے محبت کرنے کے بعد بھی ٹھکرادی جاتی ہے۔ یہ عورت ہی ہے جو اپنی بے چارگی، اپنی مجبوریوں اور مایوسیوں کا رونا رونے کے لیے گرجاگھروں، مندروں، تیرتھ استھانوں، درگاہوں اور مزاروں میں جاتی ہے اور اپنی بے بسی کا شکوہ کرتی ہے۔[۲۲]

برصغیر کی تاریخ کے مختلف ادوار میں عورت کی سماجی حیثیت اور جاگیردارانہ دور سے لے کر دورِ حاضر تک عورت کے استحصال کے جو روپ بدلے، ان کا ادراک اور اظہار قرۃ العین حیدر کے ناولوں سے پہلے اردو ادب میں نمایاں طور پر نظر نہیں آتا۔ ان کی تخلیقات میں اپنے ملک اور سماج، تہذیب و معاشرت کے درمیان زیست کرتے ہوئے جاندار کرداروں کے ذریعے تانیثی فکر و احساس کو پیش کرنے کی کامیاب سعی ملتی ہے۔

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے بعد خواتین اردو ادب میں تانیثی رجحانات بالکل واضح طور پر ابھر کر سامنے آگئے ہیں۔ اس ادب میں نسائی شناخت کے نقوش دکھائی دیتے ہیں۔ ان خواتین قلم کاروں کے تجربات، ردعمل اور نفسیات ایک نئے لب و لہجے اور اسلوب میں ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ اردو افسانے کو خواتین نے جو وسعت بخشی ہے اور جن وسیع تر انسانی تجربات سے اسے آشنا کیا ہے۔ اس کی اپنی بیش بہا قیمت ہے مگر اس میں تانیثی فکر و احساس کی شدت ہمیں ستر اور اسی کی دہائی کے بعد زیادہ نظر آتی ہے۔ اسالیب کا تنوع، تجربات اور اظہار کی جرأت ہماری نئی خواتین افسانہ نگاروں کے ہاں فن کے روشن نشانات بن کر موجود ہیں۔

اردو ادب پر تانیثی اثرات کا تجزیہ:

تانیثیت کے رجحانات نے جدید افسانہ نگار خواتین کو بلاشبہ زیادہ جرأت مند اور حوصلہ مند بنادیا ہے۔ ان کے ہاں مرد اساس معاشرے سے بغاوت کا لہجہ آہستہ آہستہ مزید ابھر کر سامنے آرہا ہے۔ اب جدید تانیثی ادب میں عورت وفا کی دیوی اور حیا کی مورت کی بجائے ایک نئے پیکر میں نمودار ہو رہی ہے جہاں اپنے وجود اور اپنی ذات کا احساس اس پر حاوی ہے۔ اختیارات و قوانین کے معیار کو خواتین افسانہ نگار نے اپنی تحریروں میں بارہا ابھارا ہے۔ ان کے فکر و اظہار سوچ اور طرزِ بیان کے درمیان پوری یگانگت ہے۔ تانیثیت اردو کی خواتین ناول نگاروں کے ہاں صنفی جذبات و کیفیات کے علاوہ مسائل کے اظہار کا بھی ایک وسیلہ ہے لیکن خواتین ناول نگاروں کے ساتھ ساتھ کئی مرد ناول نگاروں نے بھی عورتوں کے مسائل کو اپنے ناولوں میں تخلیقی اعتبار سے برت کر اردو میں تانیثی ڈسکورس کو مضبوط اور

مستحکم کیا۔ ابتدائی اردو ادب سے لے کر عصرِ حاضر تک اردو ناول نے ہر دور کے عصری مسائل اور حقائق کو پیش کیا لیکن چونکہ عورت بھی ہر زمانے میں معاشرے میں مرکزی اساس رہی ہے۔ اس لیے مرد ناول نگاروں کے ناولوں میں بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر طبقہ نسواں کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ کارفرما رہا ہے لیکن خواتین ناول نگاروں کے ہاں تانیثی ڈسکورس کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ برصغیر کے روایت پسند معاشرے میں بھی عورت اب مردوں کے شانہ بشانہ زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھ رہی ہے۔

تانیثیت ایک ایسا مثالی نظامِ معاشرت متعارف کرواتی ہے جس کی بنیاد مرد یا عورت میں سے کسی ایک کی برتری اور بالادستی پر مرکوز ہونے کی بجائے مساوی و یکساں اقدار کی نہ صرف نفی کرتی ہے بلکہ اس کے بالمقابل مکمل مساوات پر مبنی ایک نئے نظام کی تعمیر و تشکیل کا عزم بھی ظاہر کرتی ہے۔ جس کے لیے متعصبانہ ذہنیت و امتیازی سوچ کے حامل افراد کی ذہن سازی ناگزیر ہے۔ اسی ضمن میں تحریکِ نسواں سے وابستہ خواتین قلم کار اپنے جذبات، احساسات، تخیلات، انانیت، اخلاص، ایثار، محبت، شگفتگی اور دل آویزی کے ساتھ اس تحریک کو اردو ادب میں اپنی تخلیقات کے ذریعے فروغ دیتی آ رہی ہیں۔

اردو ادب میں عدم تحفظ، ذاتی شکست و ریخت اور استحصال کو تہذیبی و معاشرتی تغیر اور وجودی نقطۂ نظر کے تحت پیش کیا گیا۔ کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر نے صنفِ نازک کے ساتھ معاشرتی ناانصافیوں، سیاسی پابندیوں اور حکومتوں کے آمرانہ رویوں کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہوئے عدم مساوات اور روایتی استحصال کی وضاحت کی۔ نسائی ادب کے افسانوں میں الطاف فاطمہ، خالدہ حسین، زاہدہ حنا، یاسمین حمید، خالدہ شفیع، فاطمہ حسن اپنی تحریروں میں نسائی مسائل کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان کے علاوہ فردوس حیدر، شاہدہ حسن، ممتاز شیریں، بانو قدسیہ، نیلم بشیر احمد، نثار عزیز بٹ، عذرا عباس اور دیگر خواتین تخلیق کاروں کے ہاں عورت سے متعلق مسائل، عدم تحفظ اور معاشرتی جبر متنوع نسائی نقطۂ نظر کے تحت اجاگر ہوئی۔ عصرِ حاضر میں تانیثی تحریک اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ادب و ثقافت کے شعبے میں بھی نہ صرف نمایاں ہے بلکہ وہ عصرِ جدید میں ادبی و تخلیقی اظہار اور ڈسکورس کا ایک توانا جزو بن چکی ہے۔ یہ ڈسکورس اتنا وقیع اور ہمہ گیر ہے کہ اسے نہ تو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی خارج کیا جا سکتا ہے۔ اردو ادب کی خواتین قلم کاروں نے اس تحریک کو عملی جامہ پہنایا اور اپنی اپنی تحریروں کے ذریعے فروغ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ تمام اصناف ادب میں تانیثی فکر نمایاں طور پر نظر آ رہی ہے۔

نسائی ادب، اردو ادب کا قابلِ قدر حصہ رہا ہے۔ نسائی شعور کی روایت ہمارے ثقافتی رجحان کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہ خواتین کی ادراک و شعور کی آئینہ دار ہے۔ نسائی اظہار کا رویہ تاریخ سے منسلک ہے۔ نسائی ادب و تنقید نہ تو مغرب کی تقلید ہے نہ ہی اس کا کوئی تصادم ہمارے اقدار سے ہے بلکہ یہ ہماری آبادی کے نصف حصے کی ذہنی و فکری سفر

کا مطالعہ پیش کرتا ہے۔ یہ خواتین قلم کاروں کا نقطۂ نظر کو پیش کر رہا ہے اور دورِ حاضر کے جدید ادب میں نقطۂ نظر کی اہمیت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مابعد جدیدیت کے مختلف مکتبۂ فکر نسائی شعور کے نقطۂ نظر پر متفق ہیں۔

در حقیقت تانیثیت ان افکار و نظریات کا مجموعی اظہار ہے جو خواتین کو عزت و احترام کے ساتھ ان کے حقوق کو یقینی بناتا ہو۔ مساوات کی حمایت اور عصبیت کی مخالفت کی بدولت آج یہ تانیثی تحریک / رجحان سب سے طاقت ور نظریۂ فکر و عمل ثابت ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت نے خود شناسی اور اپنی مخصوص صلاحیتوں کو پہچان لیا ہے کیونکہ اب وہ دور نہیں رہا کہ :

بقول نوشی گیلانی:

زندگی سے نباہ کرتے رہے
شعر کہتے رہے سلگتے رہے

تانیثی شعور سے خواتین اپنی ذات کی شناخت کر رہی ہیں۔ پرانی نسائیت کو نئی جہت سے روشناس کروا رہی ہیں۔ تانیثی فکر کی جدوجہد اب زندگی کے ہر گوشے میں شامل ہو رہی ہے۔ خواتین کو ہر شعبے میں حریت ضمیر سے جینے کی آزادی دینِ اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے دی۔ یکساں مواقع، منصفانہ ماحول، عزت و تکریم اور بلند مقام، خواتین کو عظمت اور حیثیت کے طور پر اسلام ہی نے بخشا۔ یہ عزت، احترام، حقوق آزادی اور وقار خواتین کو اس سے قبل کسی دوسرے مذہب یا قانون نے نہیں دیا تھا۔ اب یہی آزادی تانیثی فلسفے کی بنیادی فکر ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فاطمہ حسن، مدون، فیمینزم اور ہم (کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۱۳ء)، ص ۶۔

۲۔ انور پاشا (مرتب)، تانیثیت اور ادب (دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص ۹۔

۳۔ مرتضیٰ علی اطہر، "تانیثیت جدید شاعری کے تناظر میں" مشمولہ تانیثیت اور ادب، مرتب: انور پاشا (دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص ۱۹۱۔

۴۔ ناصر عباس نیّر، "تانیثیت اور جدید اردو نظم" مشمولہ تانیثیت اور ادب، مرتب: انور پاشا، ص ۱۲۹۔

۵۔ لیزا ایس۔ پرائس (Lisa S. Price)، *Feminist framework: Building theory on Violence against women* dictionary.cambridge.org/dictionary/English/feminism

۶۔ عتیق اللہ، "تانیثیت: ایک سیاقی مطالعہ"، ص ۳۵ مشمولہ شبنم آرا، تانیثیت کے مباحث اور اردو ناول (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۴۔

۷۔ چارلس میورائس (Charles Maurice de Talleyrand-Perigord) Prince *de Bénévent, French statesman and diplomat, Member of national assembly.*

۸۔ ویڈن۔ سی (Weedon, C)، *An English writer, philosopher, and advocate of women's rights. Theory and the Politics of Difference lackwell*، (آکسفورڈ: ۱۹۹۹ء)، ص ۳۲۔

۹۔ An Irish statesman, economist, and philosopher. Born in Dublin, Burke served as a member of parliament (MP) between 1766 and 1794 in the House of Commons of Great Britain with the Whig Party after moving to London in 1750.

۱۰۔ عصمت چغتائی، دل کی دنیا، ص ۸۷ دیال پرنٹنگ پریس دتی۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۴۔

۱۲۔ ز۔ خ۔ ش خلد آشیانی، فردوس تخیل (لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۴۱ء)، ص ۱۱۴۔

۱۳۔ فہمیدہ ریاض،سب لعل و گہر (کلیات)(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۶۷ءتا۲۰۰۰ء)،ص۱۰۵
۱۴۔ کشور ناہید،سوختہ سامانی دل(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء)،ص۲۱
۱۵۔ کشور ناہید،دشتِ قیس میں لیلیٰ(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۱ء)،ص۲۷۹۔
۱۶۔ پروین شاکر،صد برگ(لاہور: غالب پبلشرز،۱۹۸۰ء)،ص۵۵۔
۱۷۔ پروین شاکر،ماہِ تمام(دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۱۹۹۰ء)،ص۹۲۔
۱۸۔ عصمت چغتائی اور جنگلی کبوتر کے نسوانی کردار"مشمولہ رسالہ ممبئی(ممبئی،۱۹۷۸ء)،ص۸۔
۱۹۔ عصمت چغتائی،دل کی دنیا،ص۴۔
۲۰۔ زرینہ عقیل احمد،اردو ناولوں میں سوشلزم(الٰہ آباد: اسرار کریمی پریس،۱۹۸۲ء)،ص۴۹۶
۲۱۔ قیصر جہاں،"اردو ادب میں تانیثی رجحان: مغربی تانیثیت کے پس منظر میں"مشمولہ اردو میں نسائی ادب کا منظر نامہ،(علی گڑھ: شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،۲۰۰۴ء)،ص۸۳۔۸۴
۲۲۔ قرۃ العین حیدر،یادوں کی اک دھنک جلے،(لکھنؤ یونیورسٹی، سن ندارد)،ص۱۳۶۔

باب دوم:

کلامِ اقبال (اردو) میں خواتین کے حقوق کا تذکرہ اور آزادیٔ نسواں کے مسائل

باب دوم:

کلام اقبال (اردو) میں خواتین کے حقوق کا تذکرہ اور آزادی نسواں کے مسائل

دینِ اسلام ہی ایسا واحد مذہب ہے جو عورت اور مرد کو انسانیت کی بناء پر مساوی اور ایک وحدت قرار دیتا ہے تاکہ وہ تمام غلط نظریات ختم ہو جائیں جو عورت کو مرد سے کم تر مخلوق بتاتے ہیں اور اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں اقبال عورت کے بارے میں نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں کہ اسلام صنفی تعلق کو فطری حقائق کی بنیاد پر قائم کرتا ہے اور پھر اس تعلق کے تمام نفسیاتی اور عملی پہلو بیان کرتا ہے۔

اقبال عورتوں کی آزادی کے اس حد تک قائل ہیں جس حد تک اسلام نے عورتوں کے لئے حد متعین کر رکھی ہے۔ دین اسلام ایک فطری مذہب ہے اور اسلام میں اگر عورتوں کی آزادی کو ایک حد تک متعین کیا ہے تو اس میں فطری راز پوشیدہ ہیں۔ قدرت کا یہ راز ہے کہ اس نے ہر قیمتی خزانے کو ہزاروں پردوں میں پوشیدہ کر رکھا ہے یہی پوشیدگی دراصل اس قیمتی جوہر کی قدر و قیمت کو ظاہر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال عورت کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا نمونہ اختیار کریں اور زندگی کے اسرار و رموز سے آشنا ہوں۔ در حقیقت دینِ اسلام نے طبقۂ نسواں کو وہ مقام و مرتبہ دیا جو اس صنفِ انسانی کو نہ تو پہلے کبھی ملا تھا اور نہ ہی آج تک مل سکا ہے۔ مفکر اسلام علامہ محمد اقبال کا عورت کے بارے میں نظریہ اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ وہ قرآن مجید کی روشنی میں عورت کو اس کے حقوق و فرائض کا احساس دلاتے ہیں اور دورِ جدید میں عصری تقاضوں کے مطابق معاشرے میں پیش آنے والی تبدیلیوں کے عورت کی ذات پر مرتسم ہونے والے مثبت و منفی اثرات سے اسے آگاہ کرتے ہیں۔

اقبال کی نظر میں عورت کا ایک مخصوص دائرہ کار ہے۔ وہ عورت کے لیے وہی طرزِ حیات پسند کرتے ہیں جو اسلام کے ابتدائی دور میں تھا کہ عورت شریعت کے عین مطابق شرم و حیا اور عفت و عصمت کے پورے احساس کے ساتھ زندگی کی تمام سرگرمیوں میں حصہ لے سکتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اس حوالے سے اقبال کا اپنا ایک مخصوص نظریہ ہے جس سے ان کی ایک نظم فاطمہ بنت عبداللہ کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس نظم میں اقبال عورت کی عظمت اور مقام کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے ایک جنگ کے میدان میں سرگرم عمل دکھاتے ہیں کہ عورت شریعت کے تمام اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے زندگی کے کسی بھی شعبے میں اپنی طاقت کا لوہا منوا سکتی ہے خواہ وہ شعبہ

جنگ کا میدان ہی کیوں نہ ہو-اس ضمن میں ۱۹۱۲ء میں طرابلس کی جنگ میں ایک عرب لڑکی فاطمہ بنت عبد اللہ غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہو گئی تو اس واقعہ سے اقبال اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اس لڑکی فاطمہ بنت عبد اللہ کے نام کو عنوان بنا کر اپنی مشہور نظم لکھی-

فاطمہ ! تو آبروئے ملت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر!
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر!
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی[۱]

(بانگ درا)

اس نظم میں علامہ اقبال ایک چودہ سالہ عرب لڑکی فاطمہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے فاطمہ ! تو نے امت مسلمہ کے لئے عزت اور آبرو کا باعث بن کر جو شہادت کا رتبہ حاصل کیا ہے وہ تمام امت مسلمہ کے لئے قابل فخر ہے -اقبال فاطمہ بنت عبداللہ کے جذبہ اور ہمت کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمہاری شہادت نے مسلمانوں کے اندر زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی ہے، مسلمانوں کی جو جذبات نے دم توڑ رہے تھے وہ تمہارے جذبہ شہادت کو دیکھتے ہوئے پھر سے بیدار ہو گئے ہیں-خاص طور پر امت مسلمہ کی خواتین میں ایک جوش اور ولولہ ابھر کر سامنے آیا ہے کہ وہ اپنے قوت بازو کے زور پر زندگی کے کسی بھی میدان میں حصہ لے سکتی ہیں-اس جذبے کو آگے بڑھاتے ہوئے مسلمان ایک دن ضرور اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر لیں گے-

اسی طرح اقبال کے کلام میں عورت کی عظمت و مقام کا احساس ان کی شاعری سے ہوتا ہے جہاں وہ اپنی ایک نظم "**ہنر وران ہند**" میں ایسے تمام شعراء سے شکایت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو عورت جیسے اعلیٰ مرتبت اور مقدس وجود کے نام کا غلط استعمال کر کے ادب کی پاکیزگی، بلندی اور مقصدیت کو ٹھیس پہنچاتے ہیں۔ جو صرف عورت کے دلفریب حسن کو اپنی شاعری میں پروتے ہیں لیکن اس کی عظمت اور مقام سے ناآشنا ہیں-جو مقام اور مرتبہ خدائے باری تعالی نے عورت کی ذات کے ساتھ منسوب کر دیا ہے اور جو حقوق و فرائض عورت کے لیے متعین کیے گئے ہیں انہیں اجاگر کرنے کے بجائے نسوانی حسن کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں- اگرچہ اقبال کے کلام میں بھی عورت کا ایک رومانوی و جمالیاتی تصور دکھائی دیتا ہے جہاں وہ عورت کو اس کائنات میں رنگ اور زندگی کا سوز دروں کہتے ہیں-

لیکن اس کے ساتھ ہی ہیں وہ عورت کی عظمت و مقام کا احساس دلاتے ہوئے اس کے حقوق و فرائض سے آشنا کرتے ہیں۔

چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعضاء پہ عورت ہے سوار

(ضربِ کلیم)

آغازِ شاعری میں اقبال کے ہاں روایتی شعراء کے مخصوص تصورِ زن کی روشنی میں عورت کا ایک رومانوی و جمالیاتی تصور ملتا ہے جہاں وہ داغؔ اور امیر مینائیؔ کے رنگِ تغزل کے علاوہ عورت کا ایک تاثر آفریں جمالیاتی پیکر تراشتے ہیں اور یوں عورت کا ایک جمالی و ذہنی پیکر مکمل ہو جاتا ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک عورت کا فطری مقام و مرتبہ بیوی اور ماں کا ہے۔اس حیثیت سے عورت بقائے نسل انسانی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔لہذا معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں عورت کا منصب زوجیت اور امومت کا ہے۔ اقبال اس حقیقت سے واقف تھے کہ معاشرتی زندگی میں امومت کا نقطہ نظر سے عورت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے لہذا وہ عورت کی اخلاقی، سماجی، تمدنی اور انسانی حیثیت کو انتہائی باوقار دیکھنا چاہتے ہیں۔ان کی نگاہ میں عورت کی تخلیق بالفاظ دیگر نظام کائنات کی تخلیق ہے—چنانچہ مسرت و شادمانی اور اطمینان و سکون کا مرکز و محور عورت ہی ہے۔

اقبال نے ضربِ کلیم کے ایک معروف قطعہ میں نہایت حکیمانہ، بصیرت افروز اور خوب صورت پیرایے میں عورت کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا دُرِ مکنوں!
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں![۲]

مذکورہ بالا اشعار سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال کے نزدیک عورت کا مقام و مرتبہ کیا ہے۔اس دنیا کی ساری

دلکشی اور رنگینی عورت ہی کی بدولت ہے مگر یہ رنگینی اس کے ظاہریت تک محدود نہیں۔زندگی کا سوز عشق اسی کے ساز کی آواز ہے۔اور تمام عظمتوں اور سربلندی کا سرچشمہ عورت ہی ہے۔یہ بلند مقام عورت کو اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ دنیا میں ایک اہم کردار بیوی اور ماں کی حیثیت کا ادا کرے۔کائنات میں نسل انسانی کے تسلسل کو برقرار رکھنا بھی اس کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔اگر عورت نے فلسفے کی کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی جیسے افلاطون کے مکالمات ہیں لیکن اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ افلاطون کی چنگاری بھی عورت کے شعلے سے پیدا ہوئی یعنی افلاطون جیسا عظیم فلسفی بھی عورت ہی کی آغوش میں پرورش پاکر بلند مرتبہ پر فائز ہوا۔یہی وجہ ہے کہ اقبال تمام سربلندیوں، عظمتوں اور سرگرمیوں کا محرک عورت ہی کو قرار دیتے ہیں۔عورت ہی نے ایسے انسانوں کو جنم دیا ہے جو آسمان عظمت پر ستارے بن کر جگمگا رہے ہیں۔اس لئے قابل احترام اور عظیم تر وہ ہستیاں ہیں جو خود پس منظر میں رہ کر قوم کو صالحین، مفکرین اور مدبرین مہیا کرتی ہیں۔اقبال کی ہمہ گیر فکر کی بنیاد دراصل قرآن وسنت کی یہی تعلیمات ہیں اور یہ تعلیم انہیں آغوش مادر میں ملی ہے وہ اپنی ان تمام عظمتوں کا سبب اسی تعلیم وتربیت کو گردانتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ اگرچہ اس کائنات کے تمام رنگ عورت کے ہی وجود سے ہیں اور اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں ہے لیکن ان تمام جمالیات سے بالاتر عورت کی ذات میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ افلاطون جیسے عظیم فلسفی کو جنم دیتی ہے جو اس معاشرے کو مثالی اور ترقی یافتہ بنانے کا ہنر رکھتا ہے۔عورت ہی اپنے وجود سے صلاح الدین ایوبی، محمد بن قاسم، محمد فاتح، ابن الہیثم، ابن خلدون، ابن رشد، ارسطو، سقراط، افلاطون جیسے عظیم فلسفی اور عظیم بزرگان دین کو جنم دیتی ہے جو دین ودنیا کے بقا اور معاشرے کی تعمیر وترقی اور استحکام کے لیے اعلی کردار ادا کرتے ہیں۔ ان تمام کا تذکرہ کرتے ہوئے اقبال نے اپنی شاعری میں عورت کو اس کے مقام ومرتبہ کا احساس دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمہاری اہمیت اور حیثیت معاشرے میں کبھی بھی کم نہیں ہوسکتی جب تک کہ تم اپنی اعلی مرتبت حیثیت کا احساس اپنی وجود میں پیدا نہ کرو۔اقبال اپنی شاعری میں جابجا عورت کو اس کی ذات کا احساس دلاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔برصغیر میں اقبال ہی واحد ایک ایسے شاعر اور مفکر ہیں جو اپنی شعری اور نثری کلام میں عورت کے حسن کے ساتھ ساتھ اس کے حقوق وفرائض اور اس کی عظمت ومقام کو واضح کرتے ہیں۔

عورت کے مقام وعظمت اور حقوق وفرائض کو بیان کرتے ہوئے اقبال اسلام کے اس نقطہ نظر کے قائل ہیں کہ معاشرے میں تعمیر وترقی اور اصلاح وفلاح اسی صورت ممکن ہے کہ معاشرے میں دونوں ارکان یعنی مرد اور عورت باہمی تعاون سے کام لیں۔جس طرح زندگی کو بہتر چلانے کے لیے مرد اور عورت کو گاڑی کے دو پہیے سمجھا جاتا ہے اسی طرح معاشرے میں فلاح اور بہبود کے لیے مرد اور عورت کی باہمی مفاہمت بے حد ضروری ہے۔کیونکہ جب تک یہ دونوں باہمی تعاون کے ساتھ کام نہیں کریں گے تب تک معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہوسکتا۔کی ترقی یافتہ

اور پڑھے لکھے معاشرے کے لیے مرد اور عورت کا مرد اور عورت دونوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے-اسی لئے دین اسلام میں علم حاصل کرنا مرد اور عورت دونوں کیلئے ضروری کہا گیا ہے اسلام میں کسی ایک صنف کو کو دوسری سب پر برتری حاصل نہیں ہے-سوائے کچھ اہم ذمہ داریوں کے-مرد و عورت بحیثیت میاں بیوی بہن بھائی بیٹا بیٹی کے کردار میں ذمہ داریاں مختلف ہیں-اسلام میں مرد اور عورت کو ایک دوسرے پر برتری حاصل نہیں ہے بلکہ ان دونوں کی حقوق مساوی ہیں اسی حوالے سے اقبال اپنے فارسی کلام میں فرماتے ہیں۔

مرد و زن وابستۂ یک دیگر اند

کائناتِ شوق را صورت گراند

زن نگہدا رندہ نار حیات

فطرتِ او لوحِ اسرارِ حیات

آتش مارا بجان خود زند

جوہر او خاکِ رادم کند[۳]

اقبال شعری کلام اور نثری تحریروں میں عورت کے مقام و منصب پر روشنی ڈالتے ہوئے عورت کو تمدن کی جڑ قرار دیتے ہیں-ان کی نزدیک عورت بحیثیت بیوی، ماں، بیٹی اور بہن کے بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے-اگر تمدن کو ایک درخت سے تشبیہ دی جائے تو اس میں جڑ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا-کیوں کہ جڑ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اگر کھوکھلی ہو جائے یا کمزور ہو جائے تو درخت گر پڑے گا-گویا مرد کو سہارا دینے والی اور اس کو مضبوط رکھنے والی عورت ہی ہے-جڑ اگر مضبوط ہو گی تو درخت ہرا بھرا رہے گا ورنہ مرجھا جائے گا-

اقبال تنظیمی معاشرے میں عورت اور مرد کی یکساں حیثیت کو تسلیم کرتے ہیں-ان کے نزدیک تشکیل معاشرہ کے سلسلے میں دونوں کی حیثیت برابر ہے مگر تشکیل کے بعد تعمیر معاشرہ میں عورت کا کردار مرد سے کہیں بڑھ کر اہمیت کا حامل ہے-اس لیے کہ اولاد کی تربیت عورت کی اصلی ذمہ داری ہے اور یہ فرض بغیر جذبہ امومت کے ادا نہیں کیا جاسکتا-اس لیے اقبال نے عورت کی تعلیم و تربیت کے لئے جو لائحہ عمل متعین کیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک مسلمان عورت کو ایسی تعلیم و تربیت سے مزین کیا جائے کہ وہ عملی زندگی میں اسلام کی تعلیمات کے مطابق اپنے حقوق کا تحفظ کر سکے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے فرائض بھی احسن طریقے سے انجام دے سکے-اقبال کے نزدیک یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ قومی سطح پر عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اقبال کے مجوزہ مضامین پڑھانے کا اہتمام کیا

جائے تاکہ عورت حقیقی معنوں میں ایک مسلمان عورت کی حیثیت سے اسلامی معاشرے میں زندگی گزار سکے اور اپنا موثر کردار ادا کر سکے۔

اقبال کی مذکورہ بالا نظم خلافت آدم کا مضمون اسی آیت سے ماخوذ ہے کہ اسلام کی یہ تنظیم انسانی فطرت اور معاشرے میں مرد و عورت کے کردار سے پوری طرح ہم آہنگ ہے اور مشیتِ ایزدی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مرد و عورت میں کوئی تفریق نہیں بلکہ یہ دونوں مساوی اور ایک وحدت ہیں۔ جہاں اسلام بلا تفریق مرد اور عورت کے مساوی حقوق متعین کرتا ہے وہاں اقبال اپنی شاعری میں بھی یہی فرماتے ہیں کہ عورت کسی بھی حوالے سے مرد سے کمتر نہیں ہے بلکہ ان دونوں کے باہمی تعاون میں ہی معاشرے کی تعمیر و ترقی اور اصلاح کا راز مضمر ہے۔

اگر اقبال کے تصورِ عورت کو مد نظر رکھتے ہوئے کلام اقبال کا جائزہ لیا جائے تو انہوں نے نا صرف اردو کلام میں عورت کے مقام و عظمت کا ذکر کیا ہے بلکہ اپنے فارسی شعری کلام میں بھی کئی جگہوں پر عورت کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے۔اسی حوالے سے فارسی شعری مجموعہ کلام رموزِ بے خودی میں تحسینی پیرائے میں عورت کے مقام و مرتبہ کی وضاحت یوں کی ہے۔

نغمۂ خیزاز زخمہ زن سازِ مرد
از نیاز او د و بالا نازِ مرد
پوشش عریانی مرداں زن است
حسن دلجو عشق را پیراہن است
عشق حق پروردۂ آغوشِ اُو
ایں نوا از زخمۂ خاموشِ او
آنکہ نازو بر وجودش کائنات
ذکرِ او فرمود باطیب و صلوۃ[۴]

اقبال قرآنی تعلیمات کے مطابق عورت اور مرد کے باہمی تعلقات کے حامی ہیں— کیوں کہ یورپ میں شہوت پرستی اور آزادی نسواں کی تحریک نے مرد اور عورت دونوں کو پاکیزہ تعلق سے دور کر دیا ہے اور انہوں نے اس طریقے کو اپنا لیا جو یونان اور روم کی تہذیب کے زوال میں اس دور کے لوگوں نے اپنایا تھا-عورت اور مرد خاندان کی بنیادی اکائی ہیں، جب وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوتے ہیں تو خاندان کی ابتدا ہوتی ہے پھر جب ان کی اولاد ہوتی ہے تو اس خاندان میں توسیع ہو جاتی ہے اور یوں ایک پورا معاشرہ وجود میں آتا ہے-اقبال کے نزدیک زوجیت اور امومت ہی

عورت کا فطری اور حقیقی منصب و مقام ہے۔عورت کے لیے وہ یہی مقام متعین کرتے ہیں۔انہوں نے اپنے شعری کلام اور نثری نگارشات میں عورت کی ان دو حیثیتوں کو نمایاں کیا ہے۔اقبال کہتے ہیں کہ عورت اپنی ان دو حیثیتوں میں یعنی بیوی اور ماں بن کر فطرت کی دو عظیم الشان مقاصد، بقائے تسلسل نسل انسانی اور ملت و معاشرے کی تعمیر و تشکیل کرتی ہے۔

عورت کے وجود سے ہی مرد کی ہستی کا ثبات ہے جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ عورت مرد کے لیے بہترین لباس ہے اور عورت کا دلفریب حسن مرد کے عشق کے لیے پیرہن کی حیثیت رکھتا ہے۔خدا کا عشق بھی عورت کی صورت میں گندھا ہوا ہے اور اس کی آغوش میں پرورش پاتا ہے۔یہ عورت ہی کا وجود ہے جس پر کائنات فخر کرتی ہے اور جس کا ذکر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشبو اور نماز کے ساتھ فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا مجھے تین چیزیں محبوب ہیں نماز، خوشبو اور عورت۔یعنی نبی کریم نے ابھی محبوب ترین چیزوں میں عورت کی ذات کو ہی اہمیت دی۔اسی حوالے سے اگر دیکھا جائے تو اسلام میں آج سے چودہ سو سال قبل عورت کے حقوق و فرائض اور اس کے مقام و عظمت کا معیار متعین کیا تھا اور جو مقام و مرتبہ اسلام نے عورت کو دیا ہے اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اقبال بھی اپنی شاعری میں عورت کو عزت و احترام کا درجہ دیتے ہیں۔

فکریاتِ اقبال میں عورت کی ذہنی و نفسیاتی ساخت اور اس کے حقوق و فرائض کی روشنی میں تشکیل پانے والے تصورِ زن کے ضمن میں اقبال کے ہاں تصورِ عورت کو بعض متنوع اور قابلِ فہم جہتوں میں تدریجی انداز میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس اصول کے تحت اوّلاً فکرِ اقبال میں عورت کے رومانی و جمالیاتی تصور کو دیکھا جائے تو اقبال اپنی ابتدائی شاعری ہی سے مطبوعہ کلام میں عورت کے ظاہری و باطنی حسن پر تفکر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔اس سلسلے میں اقبال کا بانگِ درا کے دورِ اوّل کا غیر مطبوعہ متروکہ کلام ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ جہاں وہ متفرق مقامات پر تو اس حوالے سے غور و فکر کرتے ہیں لیکن ایک نظم عورت میں فطرت کے مختلف مظاہر کے اشتراک سے اس کے وجود کی تخلیق کی طرف خصوصیت کے ساتھ رومانوی اشارات بہم پہنچاتے ہیں۔

کلامِ اقبال میں چاند، گھاس، سانپ، بید مجنوں، بیلوں، صبا، ابر، طاؤس، گلِ کہسار، دیدۂ آہوئے چیں، نورِ خورشید، خرگوش، چیتے، برف، الماس، طوطی گلزار، قمری اور بلبل وغیرہ سے متعلق خصوصیات عورت کی ذات کے داخلی و خارجی حسن میں دخیل ملتی ہیں۔اسی حوالے سے اپنی ایک نظم میں اقبال عورت کی ذات کے تخلیقی عمل کو خوبصورت پیرائے میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

گندھ گندھا کر یہ مصالحہ جب اکٹھا ہو گیا
دستِ قدرت نے بنایا ایک ڈھانچا نور کا

آگ کا جوبن ہوا اور نور کی صورت بنی
شکل عورت کی بنی، کیا موہنی مورت بنی[۵]

عورت کا ایک ایسا تصور اقبال کے ہاں ابتدا ہی سے نظر آتا ہے جس میں ستائشی پہلو غالب رہا۔ بانگِ درا کے دوسرے دور میں حسن و عشق، کلی، وصال۔۔۔ کی گود میں بلی دیکھ کر اور سلیمیٰ جیسی منظومات میں یا پھر اسی مجموعے کے دور اوّل کی غزلیات میں اقبال نے خاصا روایتی اور اکتسابی رنگ جمایا ہے جہاں عورت کا رومان پرور تصور بھرپور شعری آہنگ کے ساتھ ترتیب پاتا ہے۔ ذیل میں چند غزلیہ شعر مثال کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تیری آنکھ مستی میں ہشیار کی تھی[۶]

چھپتی نہیں ہے یہ نگہِ شوق، ہم نشیں
پھر اور کس طرح انھیں دیکھا کرے کوئی[۷]

ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں[۸]

منظومات میں یہ جمالی و تاثراتی رنگ تقویت اختیار کر گیا ہے مثلاً حسن و عشق میں وہ عورت کو حاصل زیست قرار دیتے ہوئے خالصتاً ایک رومانوی شاعر کے لب و لہجے میں گویا ہوتے ہیں۔

تو جو محفل ہے، تو ہنگامۂ محفل ہوں میں
حسن کی برق ہے تو، عشق کا حاصل ہوں میں
تو سحر ہے، تو مرے اشک ہیں شبنم تیری
شامِ غربت ہوں اگر میں، تو شفق تو میری
مرے دل میں تری زلفوں کی پریشانی ہے
تری تصویر سے پیدا مری حیرانی ہے
حُسن کامل ہے تیرا، عشق ہے کامل میرا[۹]

اسی طرح اقبال اپنی ایک نظم سلیمیٰ میں بہت جان دار اسلوب میں کائنات کی مختلف اشیاء میں حسن مطلق کی متنوع جھلکیاں دکھاتے ہوئے سلیمیٰ کی نگاہوں میں انتہائے حُسن کو محسوس کرواتے ہیں۔ یوں گویا عورت مرکزِ کائنات ٹھہرتی ہے۔ اقبال کے قلم سے یہ رومانوی شعر پارے تخلیق ہوتے ہیں جو عورت کے رومانوی و جمالیاتی وجود کا اثبات کراتے ہیں۔

مرے خورشید! کبھی تُو بھی اٹھا اپنی نقاب
بہرِ نظارہ تڑپتی ہے نگاہِ بے تاب[10]

خود تڑپتا تھا، چمن والوں کو بھی تڑپاتا تھا میں
تجھ کو جب رنگیں نوا پاتا تھا، شرماتا تھا میں[11]

ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا
آنکھوں میں ہے سلیمیٰ! تیری کمال اس کا[12]

علامہ اقبال نے اپنے اردو شعری کلام میں کئی جگہوں پر عورت کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے۔ بانگِ درا میں اقبال نے فاطمہ بنت عبداللہ اور والدہ مرحومہ کی یاد میں دو نظمیں لکھیں۔ اس کے علاوہ ظریفانہ میں عورت کے موضوع سے متعلق تین رباعیاں بھی موجود ہیں۔

ضربِ کلیم میں عورت کے عنوان سے ایک پورا باب ملتا ہے جو نو (۹) نظموں پر مشتمل ہے۔ ارمغانِ حجاز میں دخترانِ ملت کے زیرِ عنوان آٹھ (۸) رباعیات ملتی ہیں۔ رموزِ بیخودی میں تین عنوانات عورت کے موضوع کے مقصد کے لیے وقف کیے گئے ہیں۔ فارسی مثنوی پس چہ باید کرد میں فصل پنجم (حکمت فرعونی) میں اس موضوع پر اقبال نے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ جاوید نامہ میں افلاک کی سیر کے دوران مختلف انداز اور مختلف طریقوں سے عورت کے تصور کو پیش کیا ہے۔

اقبال کے نزدیک وہ بلند کردار خواتین قابلِ احترام ہیں جو اعلیٰ مقاصد کی خاطر اپنی جان کی پروا بھی نہیں کرتیں۔ ان کی زندگی کا مقصد ملک و قوم کی خدمت ہوتا ہے نہ کہ عشوہ گری اور بے حیائی۔ جنگِ طرابلس کی مجاہدہ فاطمہ بنت عبداللہ کو علامہ اقبال اس طرح خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

فاطمہ! تو آبروئے امت مرحوم ہے

ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے

یہ سعادت حورِ صحرائی تیری قسمت میں تھی

غازیانِ دین کی سقائی تیری قسمت میں تھی

یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر

ہے جسارت آفرین شوقِ شہادات کس قدر[۱۳]

اقبال، فاطمہ بنتِ عبداللہ کو ایک چنگاری سے تشبیہ دیتے ہیں جس سے قوم کے دل میں ایمان روشن ہوتا ہے۔ وہ عورت کو زندگی کی آب و تاب قرار دیتے ہیں۔ اس کی پاکیزگی، عفت و عصمت اور کردار کی بلندی نسلِ انسانی کی بلندی ہے۔ جاوید نامہ میں محکماتِ عالم قرآنی کے زیرِ عنوان جب اقبال عظمت آدم کا ذکر کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بیان فرماتے ہیں کہ عظمتِ انسانی میں مرد کے ساتھ عورت بھی شریک ہے۔ آدم گری کا اہم ترین کام عورت کی عفت مآبی سے انجام پذیر ہوتا ہے۔ اقبال انسانی زندگی میں عورت کا مقام بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہوتے ہیں۔

زندگی ای زندہ دل دانی کہ چیست؟

عشق یک بین در تماشای دوئی است

مرد و زن وابستۂ یک دیگر اند

کائناتِ شوق را صورت گراند!

زن نگہ دارندہ ی نارِ حیات

فطرتِ او لوحِ اسرارِ حیات[۱۴]

اقبال کے نزدیک عورت کے لیے فریضۂ امومت کی انجام دہی بے حد ضروری ہے اور وہ طبقۂ نسواں کو اپنے نقطۂ نظر سے روشناس کرانے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ عورت احسن طریقے سے تربیت اطفال کر کے امومت کے فرض کو نبھا سکتی ہے کیونکہ اقوام کی ترقی کا راز روپے، پیسے یا دولت کی فراوانی سے نہیں بلکہ ایسے فرزند ہائے تن درست کی تخلیق میں مضمر ہے، جو تر دماغ، سخت کوش اور چاق و چست ہوں۔ اقبال کے ہاں عورت کا درجۂ امومت کس حد تک پسندیدہ ہے، اس کا اندازہ اقبال کے کلام رموزِ بے خودی کے درج ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے:

بر دمد ایں لالہ زارِ ممکنات

از خیابانِ ریاضِ اُمہات

قوم را سرمایہ اے صاحب نظر

نیست از نقد و قماش و سیم و زر

مالِ او فرزند ہائے تندرست

تر دماغ و سخت کوش و چاق و چست

تر دماغ و سخت کوش و چاق و چست

قوتِ قرآن و ملت مادراں[۱۵]

(نسل انسانی کے وجود کے اسرار و رموز ماں ہی کی تربیت کی بدولت نکھر کر سامنے آتے ہیں۔ تمام اہل علم یہ جان لیں کہ قوم کے لئے حقیقی سرمایہ یا دولت مال و اسباب نہیں بلکہ قوم کا سرمایہ ایسی چاک و چوبند نوجوان نسل ہے جو محنت کش اور ذہین و فطین ہو۔ ماں اخوت و محبت کی علامت ہے وہی اپنی اولاد کو قرآن کی قوت سے روشناس کرواتی ہے اور اور ملک و قوم کی محبت کو ان کے سینوں میں ڈھالتی ہے۔)

اسی طرح اقبال ارمغانِ حجاز (فارسی) میں دخترانِ ملت کے عنوان سے ایک نظم میں "مثالی عورت" کے تصور کی توضیح و تشریح بیان کرتے ہوئے امومت و تربیت کے فرائض کی نشان دہی کرتے ہیں:

جہاں را محکمی از امہات است

نہادِ شان امینِ ممکنات است

اگر ایں نکتہ را قومے نداند

نظامِ کاروبارش بے ثبات است[۱۶]

(اس کائنات میں نسل انسانی ماں کے وجود سے ہی استحکام پاتی ہے۔ اس کا وجود بھی آنے والی تمام نسلوں کے امکانات کا پاسدار ہے۔ لیکن جس قوم نے اس حقیقت کو نہ سمجھا اس کی نظام زندگی بے معنی ہے۔)

اقبال کی نظر میں تمام دنیاوی سرگرمیوں کی بنیاد ماں کی ذات ہے۔ ماں کی ذات ہی امین ممکنات ہوتی ہے اور دنیا کے انقلابات ماؤں کی گود میں ہی پرورش پاتے ہیں۔ اسی لیے ماں کی ہستی کسی قوم کے لیے سب سے زیادہ قیمتی متاع ہوتی ہے۔ ماں کی ہستی اس قدر بلند مرتبت ہے کہ قوم کے حال اور مستقبل انہی کے فیض سے ترتیب پاتا ہے۔ قوم کی

تقدیر بنانے میں بنیادی کردار ماں کا ہوتا ہے۔ معاشرتی اور سماجی زندگی میں ماں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور خاندانوں کی زندگی بھی اسی جذبۂ امومت سے وابستہ ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے ایک عورت کی بنیادی ذمہ داری اپنے گھر کی اندرونی فلاح و بہبود پر توجہ مرکوز رکھنا قرار پاتی ہے۔ اس ہمہ جہتی ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے اسلام نے عورت کو بیرونِ خانہ عبادات اور دیگر ذمہ داریوں سے استثناء عطا کیا ہے۔ یعنی اسے فکرِ معاش اور خاندان کی یا پھر اپنی کفالت کی ذمہ داری سے بھی چھوٹ دی ہے۔ حتیٰ کہ عورت کو نماز باجماعت، نمازِ جمعہ اور نمازِ جنازہ وغیرہ سے بھی رخصت دی گئی ہے۔ البتہ اپنے حالات کا لحاظ رکھتے ہوئے عورت اپنے زائد وقت کو اپنی اور اپنے خاندان کی معاشی فلاح اور معاشرے کے لیے مفید اور کارآمد سرگرمیوں کے لیے استعمال کر سکتی ہے۔ لیکن یہ بات اہم ہے کہ بنیادی طور پر عورت کو معاشی جدوجہد اور ملک کی معاشی ترقی کا ذمہ دار نہیں بنایا گیا بلکہ اسے نسلِ نو کی پیدائش، پرورش اور تربیت کے حوالے سے انسانیت سازی کا فریضہ سونپا گیا ہے۔

فکریاتِ اقبال میں نسلِ نو کی پیدائش اور انسانیت سازی کا یہ فریضہ امومت کے نام سے سامنے آتا ہے۔ امومت خالصتاً تربیت اور تخلیق انسانی کا ایک فطری عمل ہے۔ اس نکتے کے تحت اقبال نے بڑی مہارت کے ساتھ تعلیم و تہذیب، آزادی و دائرہ آزادی، فعالیت و نیم فعالیت، ادائیگی فرائض اور نسوانی حیا جیسے موضوعات کو چھیڑا ہے اور حقیقی معنوں میں ان کے مطابق یہ نکتہ سرتاسر فرائض نسواں کے گرد گھومتا ہے۔ یہاں عورت قربانی کی تفسیر دکھائی دیتی ہے۔ خصوصاً ملتِ اسلامیہ میں امومت و تربیت کے جو اصول نہایت اہم سمجھے جاتے ہیں، اقبال نے بڑی تفصیل کے ساتھ ان پر روشنی ڈالی ہے۔

اقبال مغرب کے اس خیال سے متفق نہیں ہیں کہ مرد و زن میں کامل مساوات ہے۔ وہ قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں عورتوں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں نیز مرد اور عورت کے جداگانہ فرائض کی ادائیگی پر زور دیتے ہیں کیونکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق عورت کا فرض امومت کی ادائیگی ہے اور مرد کا فرض اپنے خاندان کو تحفظ دینا ہے۔ گھر ایک ایسی اکائی ہے جو مرد اور عورت کے لئے ایک محور و مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ دونوں اولاد کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ اسے پیار و محبت سے پالتے ہیں۔ اب جہاں تک مرد کا تعلق ہے، اس کا زیادہ تر وقت گھر سے باہر معاش کے حصول کے لیے گزرتا ہے لہذا تربیت اولاد کے ضمن میں ماں کا کردار اساسی اہمیت کا حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے" مگر یہ اعزاز صرف پاکیزہ بیوی اور پاکیزہ ماں کے لئے ہے۔

کلامِ اقبال میں تصور امومت کا انسلاک لذتِ تخلیق سے کرتے ہوئے عورت کے ذریعے معرکۂ بود و نبود گرم دکھایا گیا ہے۔ "عورت" کے عنوان سے ایک قطعہ میں اقبال لکھتے ہیں:

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منت غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہر عورت کی نمود!
راز ہے اس کے تپِ غم کا یہی نکتۂ شوق
آتشیں لذتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود!
کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرارِ حیات
گرم اسی آگ سے ہے معرکۂ بود و نبود!
میں بھی مظلومیِ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود! [۱۷]

امومت اور تربیت کے موضوع پر اقبال نے خاصے توضیحی اسلوب میں عورت کے حقیقی منصب کی طرف توجہ دلائی ہے۔ تصور امومت کی تفہیم کے بعد اقبال کے ہاں اب "وجودِ زن" سے صرف "تصویرِ کائنات میں رنگ" ہی نہیں رہتا بلکہ وہ افراد ملت کی تہذیب و تربیت میں فعال کردار ادا کرتی نظر آتی ہے۔ یہ پہلو خالصتاً فرائض نسواں سے متعلق ہے اور اقبال کے نزدیک اس کی تکمیل میں ہی بقائے حیات پنہاں ہے۔

اقبال تعلیمِ نسواں کے زبردست حامی تھے۔ اسی لیے وہ فرماتے تھے کہ مرد واحد کی تعلیم معاشرتی طور پر اتنی موثر نہیں جتنی عورت کی تعلیم کیونکہ عورت بالعموم خاندان ساز ہوتی ہے اور ایک تعلیم یافتہ خاتون تربیت خانوادہ میں زیادہ اہم اور موثر ہوتی ہے۔ اسی تصور کا خاکہ اقبال نے اپنی نظم عورت اور تعلیم میں بیان کیا ہے۔ وہ امومت اور دینی تعلیم کو عورت کے لیے اہم اور ضروری قرار دیتے رہے کیونکہ دین اس رافت اور نفرمی کا بطور خاص مبین ہے جو عورت کے معنوی فرائض کو زیب و زینت بخشتا ہے۔

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت
ہے حضرت انساں کے لیے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اس علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسہ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت [۱۸]

اقبال نے اپنے کلام کی ترجمانی کے لئے "خوب اور ناخوب"، "زن اور نازن" دونوں قسم کے کردار کو اپنے

کلام میں پیش کیا ہے-ایک طرف وہ عورتیں ہیں جو حقوق تو حاصل کرتی ہیں لیکن فرائض کے ادائیگی سے روگرداں ہیں-اس کی مثال "نبیہ مریخ" ہے، جو مغرب زدہ عورتوں کی نمائندگی کرتی ہے-دوسری طرف وہ عورتیں ہیں جو اپنے حقوق سے محروم ہیں لیکن فرائض کی ادائیگی سے گریزاں نہیں-ان کی نمائندہ حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ تعالی عنہ ہیں-اقبال کے نزدیک حضرت فاطمۃ الزہرا کا کردار مثالی نمونہ ہے جسے عورتوں کے لیے پیش نظر رکھنا ضروری ہے-اقبال چاہتے تھے کہ اسلامی معاشرے میں حضرت فاطمہ الزہرا جیسی عورتیں ہوں تاکہ ان کی تربیت اولاد سے ایسی نسل پروان چڑھے جو اسلامی ملت کے استحکام اور بقا کی ضمانت ہے۔

اقبال امومت سے گریز تعلیم کو فرنگی تہذیب کا ایک فتنہ قرار دیتے ہیں کہ یہ عالم انسانی بالخصوص مسلمانوں کے لیے تباہ کن ہے۔وہ دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم سے آگاہی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔بال عورتوں کو ایسی تعلیم دینا چاہتے تھے جس کے باعث وہ اپنے حقیقی فرائض یعنی اولاد کی تربیت امور خانہ داری اور حفظان صحت کے اصولوں سے واقف ہو کر صحیح معنوں میں شوہر کی رفیق زندگی بنیں-کیوں کہ اولاد کی تربیت میں ماؤں کا غیر معمولی حصہ ہوتا ہے جس سے کوئی دوسرا احسن طریقے سے انجام نہیں دے سکتا-اقبال نے اسلامی معاشرے میں عورت کی متعین حیثیت کے پیش نظر ہیں اس کے حقوق و فرائض کی وضاحت کی ہے-

مذہب عصر نو آئینی نگر
حاصل تہذیب لا دینی فکر

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے پیشِ نظر
وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ[19]

درج بالا اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال عورتوں کو جدید مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی ذمہ داریوں کے پیشِ نظر مشرقی وضع قطع اور مذہبی روایات کی پاسداری کے حق میں بھی تھے۔ان کے خیال میں عورتوں کو ایسے علوم کی تعلیم دی جائے جن سے ان کی نسوانی صلاحیتوں کو جلا ملے اور وہ اپنے فرائض زوجیت اور امومت کے حق کو بخوبی انجام دے سکیں۔

آزادئ نسواں کی تحریک سے مرد و زن کا تعلق جس طرح ٹوٹا اور اس کے باعث جو بُرے نتائج سامنے آئے، اقبال کی نظر میں اس کی ذمہ دار مغربی تہذیب ہے۔کیونکہ آزادئ نسواں ہو یا آزادئ دجال، یہ دونوں کوئی معنی نہیں

رکھتے بلکہ مرد و زن کا باہمی ربط، ایثار اور تعاون ایک دوسرے کے لیے ضروری ہے۔ مرد فرنگ کے عنوان سے اقبال اپنی نظم میں فرماتے ہیں:

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا
مگر یہ مسئلہ زن رہا وہیں کا وہیں
قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بے چارہ زن شناس نہیں۔[20]

اقبال کے نزدیک مغرب کی یہ انتہا پسند آزاد روی مرگِ امومت ہے اور اس کا نتیجہ تباہ کن ہے۔ تحریکِ آزادئ نسواں کے انتہا پسندانہ رویے پر اقبال اپنی شاعری کے ذریعے یوں تنقید کرتے ہیں:

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرت انسان کے لیے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت۔[21]

"عورت اور تعلیم"، ضربِ کلیم

اقبال چاہتے ہیں کہ عورت اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور ہو کر اپنے اندر ان صفات کو پیدا کرے جس کا مطالبہ اس سے اس کا خالق اور اس کے رہنما رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہتے ہیں۔ اگر کوئی عورت ان صفات کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے تو وہی بہترین اور حقیقی عورت ہے اور اسی کے ہاتھ میں امت مسلمہ کی تقدیر ہے۔

اقبال اپنے شعری مجموعہ ضربِ کلیم میں نظم آزادئ نسواں کے عنوان سے تحریک آزادئ نسواں سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے، وہ قند
کیا فائدہ، کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں، معذور ہیں، مردانِ خردمند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند![۲۲]

اقبال کہتے ہیں کہ میں اس بحث کا فیصلہ نہیں کر سکتا اگرچہ میں جانتا ہوں کہ یہ قند نہیں بلکہ زہر ہے کیونکہ عورت ہی اپنی بصیرت سے اس اس راز کو افشاں کر سکتی ہے کہ آرائش وزیبائش اور دولت میں عورت کی آزادی زیادہ قیمتی ہے یا زمرد کا گلوبند زیادہ قیمتی ہے۔یعنی عورت ہی اپنی ذات وجود سے معاشرے میں مقام اور مرتبہ حاصل کر سکتی ہے۔آزادی نسواں کا مغربی تصور عورت کی فطرت کے خلاف ہے۔اقبال اس آزادی کے خلاف ہے کیونکہ اس میں عورت کا سماجی پابندیوں کو قبول نہیں کرتیاور اولاد پیدا کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔اتاترک مصطفی کمال نے ترکی میں کچھ اصلاحات نافذ کی تھی جن سے ترک خواتین کو یورپی عورتوں کی طرح آزادی مل گئی تھی۔اس آزادی کے تبصرہ کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ جو اصلاحات مصطفی کمال پاشا نے نافذ کی ہیں وہ ہر گز حکمت پر مبنی نہیں ہیں کیونکہ عورت کو آزادی خود اسلامی شریعت دیتی ہے۔اقبال نے خواتین کے مسائل کو قرآن پاک کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے لہذا عورتوں کے متعلق ان کے خیالات تمام تر حقیقت پر مبنی ہیں۔اقبال ہر گز یہ نہیں چاہتے کہ عورتوں کو گھر کے اندر قید کر دیا جائے بلکہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے گھر سے باہر آسکتی ہیں لیکن اسلامی شریعت کی متعین کردہ حدود کی پابندی کرتے ہوئے۔مغرب سے متاثر عورتوں کی طرح بن سنور کر یا نیم عریاں لباس پہن کر نہیں۔

غرض یہ کہ اقبال کے دور سے لے کر عصرِ حاضر تک تہذیب و تمدن میں متنوع تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ مغربی تہذیب اور تحریک نسواں "تانیثی تحریک" بھی عروج پر ہیں اور مسلمان عورت بھی اکیسویں صدی میں قدم رکھ چکی ہے۔اس کے ارد گرد ترقی یافتہ دنیا موجود ہے جس میں وہ اپنا کردار نبھا رہی ہے۔پہلے کی نسبت آج مسلم ممالک میں عورتیں بھی ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر، نرس، بینکار، سیاستدان اور معیشت دان وغیرہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں اور اسلام اس سلسلے میں عورت پر کوئی پابندی نہیں لگاتا۔ویسے بھی آبادی کے آدھے حصے کو معاشی سرگرمیوں سے الگ کر کے معاشی ترقی حاصل کرنا ناممکن ہے۔اس سلسلے میں ذہنی صحت مندی کو پیدا کرنا اور اسے برقرار رکھنا ضروری ہے، جس کا تذکرہ ہمیں افکار اقبال میں ملتا ہے۔اس معاملے میں بجا طور پر اس بات پر فخر کیا جاسکتا ہے کہ مسلم تہذیب کی عورت، مغربی تہذیب کی عورت سے بہتر ہے۔مسلم معاشروں میں خاندانی نظام متوازن برقرار ہے۔عورت کی عزت

و تکریم موجود ہے۔ عورت اپنے بنیادی مسائل اور ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی کی دیگر سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہے۔ اس بارے میں علامہ اقبال بالکل بجا فرماتے ہیں کہ اگر مسلمان عورتیں صحیح اور عقل مندانہ راستہ اختیار کریں، مغرب کی اندھا دھند تقلید کے درپے نہ ہوں تو وہ قوم کی روایات کی بہترین امین بن سکتی ہیں جس سے معاشرہ ایک ترقی یافتہ اور مثبت ارتقائی تشکیل پا سکتا ہے۔

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہر عورت کی نمود
راز ہے اس کے تپِ غم کا یہی نکتۂ شوق
آتشیں، لذت تخلیق سے ہے اس کا وجود
کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرارِ حیات
گرم اسی آگ سے ہے معرکۂ بود و نبود
میں بھی مظلوم نسواں سے ہوں غم ناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود! ۔[۲۳]

(اقبال)

مذکورہ بالا اشعار میں علامہ اقبال نے عورت کی تخلیق کی صفت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسرار حیات کی عقدہ کشائی عورت ہی کی محبت بھری نظروں میں ہے۔ ازل اور ابد کی تمام ممکنات اسی رقت انگیز کو درد بھرے دل میں موجزن ہے۔ عورت نہ ہو تو بقائے انسانی کا سلسلہ جاری نہ رہ سکے۔ آخری شعر میں اقبال عورت سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ عورت کو تخلیق کے لئے جو مشقت اٹھانا پڑتی ہے، ایک طرح سے وہ مظلوم ہستی ہے۔ مگر قدرت نے عورت کو اسی مقصد کی خاطر پیدا کیا ہے لہذا اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں کہ وہ اپنے اس فرض کو نبھاتی رہے۔ اسی میں اس کی ذات کی عظمت ہے۔ اس کا مقام و منصب اسی کسی تخلیق کی بنا پر ہے کہ وہ "زن" بن کر یہ فریضہ سرانجام دے۔ غرض یہ کہ اقبال مرد اور عورت کی اساسی کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے اس حقیقت کو پیش کرتے ہیں کہ دونوں کا تنظیم معاشرت کے حوالے سے کردار مختلف ہے لیکن ان میں ہم آہنگی بھی موجود ہے۔ دونوں ہی کامل ہم آہنگی اور اتفاق و اتحاد کے ساتھ اپنے اپنے فطری دائرہ کار میں رہتے ہوئے جب تک اپنے فرائض انجام دیتے رہیں گے، معاشرے کا استحکام اور اس کا حسن باقی رہے گا۔

اقبال کے نزدیک عورت کا حقیقی کردار بیوی اور ماں کا ہے باقی تمام رشتے اسی محور کے گرد گردش کرتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ عورت کی مشت خاک اس قدر بیش بہا اور گراں قدر ہے کہ اوج ثریا اس کے سامنے ہیچ ہے۔ یہ بلند

مقام عورت میں اس لئے پایا ہے کہ وہ دنیا میں ایک اہم کردار ادا کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے اور وہ ہے ماں کی حیثیت۔ معاشرے کی تعمیر و تشکیل ماں کے ہاتھ میں ہے۔اسلامی نظام کے قیام کے لئے ایسی ماؤں کی ضرورت ہے جن کے دل و دماغ اسلامی اقدار اور اصولوں سے منور ہوں اور وہ اولاد کے ذہنوں کو ان کے مطابق ڈھال سکیں۔عورت بحیثیت بیوی اور ماں، تشکیل معاشرہ اور تعمیر ملت کے سلسلے میں جو بنیادی اور اساسی کردار ادا کرتی ہے،اقبال اسے حقیقت میں تمام تمدن کی جڑ قرار دیتے ہیں۔اقبال کی نظر میں عورت کا حقیقی منصب اور مقام بیوی اور ماں کا ہے۔اس لئے کہ بقائے نسل انسانی اور تعمیر ملت اسی کے وجود سے وابستہ ہے۔وہ کہتے ہیں کہ عورت خواہ جاھل، قدامت پرست یا ان پڑھ کیوں نہ ہو اگر وہ اپنی تربیت کی بنا پر ایک غیور اور حق پرست مومن ملت کو دے دے تو اسے ایک کامیاب عورت قرار دیا جائے گا اور اس کا یہ عمل امت مسلمہ پر ایک احسان سمجھا جائے گا۔

اقبال کے نزدیک عورت کی عظمت کا راز اسی فرض امومت میں پوشیدہ ہے معاشرتی اور سماجی زندگی میں ماں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور خاندانوں کی زندگی اسی جذبہ امومت سے وابستہ ہے--ماں کی گود پہلا دبستان ہے جو انسان کی تعمیر کرتا ہے اور پھر اسی کردار کی تشکیل کرتا ہے۔جس قوم کی مائیں بلند خیال، عالی ہمت، شائستہ اور مہذب ہوں گی،اس قوم کے بچے یقیناً ایک اچھا اور صالح معاشرہ تعمیر کرنے کے قابل ہوں گے گھر سے باہر کی زندگی میں مرد کو فوقیت حاصل ہے اور گھر کے اندر عورت کی حکومت ہے کیوں کہ اس کی ذمہ داری نئی نسل کی پرورش ہے۔اس نسل کی صحیح پرورش اور تربیت پر قوم کے مستقبل کا دار و مدار ہوتا ہے۔اسی لئے عورت کا شرف اور امتیاز اس کے ماں ہونے کی وجہ سے ہے۔جس قوم کی عورتیں فرائض امومت ادا کرنے سے کترانے لگیں اس کا معاشرتی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے،اس کا عائلی نظام انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔خاندان کے افراد کے درمیان رشتہ کمزور پڑ جاتا ہے اور اخلاقی خوبیاں دم توڑ دیتی ہیں۔اقبال چاہتے ہیں کہ ایک مسلمان عورت تنظیم معاشرت میں مؤثر کردار ادا کرنے کے لیے ایک باوفا بیوی ہوں جو اپنی عفت و عصمت کی حفاظت کرے اور اولاد کی تربیت میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرے۔اپنے مرکزی محاذ پر موجود رہے۔گھر کی ظاہری صورت پذیری ہی عورت کی مرہون منت نہیں بلکہ اگر غور کیا جائے تو گھر کی معنوی اور روحانی صورت گری میں بھی جو حصہ عورت کا ہے وہ حصہ مرد کا نہیں ہے۔اقبال چاہتے ہیں کہ مسلمان عورت اسلام کی تعلیمات کے مطابق زوجیت اور امومت کے فرائض سرانجام دے اور آئندہ نسلوں کی تربیت کی ذمہ داری بخوبی نبھائے۔اقبال کے نزدیک امومت کا فرض عورت کا فطری جذبہ ہے جسے مغرب کی تہذیب نے ختم کرنے کی بہت کوشش کی ہے۔نفس پرستی،ازدواجی زندگیوں سے گریز، خاندانی زندگی سے بیزاری اور ازدواجی تعلقات کی ناپائیداری نے عورت کے اس فطری جذبہ مادری کو تقریباً فنا کر دیا ہے۔حالانکہ یہ جذبہ نسوانی جذبات میں سب سے زیادہ اشرف و اعلیٰ اور روحانی جذبہ ہے۔جس کی بقا پر نہ صرف تمدن و تہذیب بلکہ انسانیت کی بقا کا بھی انحصار ہے۔وضع حمل، اسقاط

حمل، اور نومولود بچوں کا قتل اسی جذبہ کی موت سے پیدا ہوئے- چونکہ اقبال عورت کے جذبہ امومت اور زوجیت کے قدر دان ہیں، لیکن مرد اور عورت جب تک رشتہ ازدواج میں منسلک نہ ہوں، وہ میاں بیوی نہیں ہو سکتے اور عورت بیوی بنے بغیر ماں کے رتبے پر فائز نہیں ہو سکتی- مغرب زدہ عورت سے اقبال سخت خفا ہیں جو مسلمان ہوتے یورپ کی عورت سے متاثر ہو کر اس کے نقش قدم پر چلتی ہے-

اقبال نے عورتوں کے حقوق اور فرائض کا ذکر جس تسلسل کے ساتھ اپنے شعری کلام اور نثری تحریروں میں کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کے مسائل سے کبھی غافل نہیں رہے- فکری اعتبار سے یہ سلسلہ ان کے مقالے ''قومی زندگی اور ملت بیضا پر ایک نظر'' (۱۹۰۴ء) سے شروع ہو کر ضرب کلیم اور ارمغانِ حجاز (۱۹۳۸ء) تک یعنی کہ آپ کے انتقال تک محیط نظر آتا ہے- اس طویل عرصہ میں اقبال اسلامی معاشرے میں عورت کی حیثیت کا تعین کرنے کے لئے مسلسل لکھتے رہے- کیوں کہ اقبال عورتوں کے حالات کی اصلاح چاہتے تھے اور انہیں تعلیم سے بہرہ ور کر کے وہ مقام اور مرتبہ دلانا چاہتے تھے جو بلند مقام و مرتبہ دین اسلام نے انہیں دیا ہے- اقبال مسلمان عورتوں کو جہالت کی اتھاہ گہرائیوں سے نکالنا چاہتے تھے اور وہ یہ چاہتے تھے کہ عورتوں کی تعلیم قومی ضروریات کے مطابق ہو- اس حوالے سے اقبال قرآن و سنت کی تعلیمات سے روشنی حاصل کرتے ہیں-

اقبال اس حقیقت کا ادراک رکھتے تھے کہ اگر عورت تعلیمات اسلامی سے آگاہ ہو جائے تو یہی تعلیم، حقوق اور فرائض کا شعور اس کے اندر پیدا کرے گی اور اس شعور اور آگاہی کے بعد وہ اسلامی معاشرے میں باوقار زندگی گزارنے کے قابل ہو جائے گی- اقبال کو اس بات کا بہت دکھ تھا کہ عورتوں کو اپنے حقوق کا شعور نہیں ہے- ان کے والدین بھی اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے- وہ اسلامی معاشرے میں رہتے ہوئے بھی اپنے حقوق سے بے خبر ہوتی ہیں، انہیں قرآن پاک اور اسلامی شریعت کی تعلیمات پر توجہ دینی چاہیے تاکہ وہ اپنے حقوق و فرائض سے باخبر ہو کر معاشرے میں وہ مقام حاصل کر سکیں جو مقام اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے متعین کیا ہے-

اقبال عورتوں کی تعلیم کو اس لئے ضروری قرار دیتے ہیں تاکہ ان کے اندر اپنے حقوق کا احساس پیدا ہو اور وہ اپنے حقوق کے لیے شدت سے اصرار کریں- اسلامی شریعت میں عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق دیے ہیں لیکن عورت اپنی کم علمی کی بنا پر اپنے حقوق سے غافل ہے اور جس کا معاشرے پر منفی اثر پڑتا ہے اور عورتوں کی زندگی مشکل سے دوچار رہتی ہے- اقبال چاہتے ہیں کہ عورت اپنے حقوق کو جانے اور پورے شعور کے ساتھ اپنے فرائض کا دائرہ بھی متعین کریں اور اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارے- اقبال نے حقوق کے تحفظ کا شعور پیدا کرنے کے لیے فقہ اسلامی کی تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا ہے تاکہ عورتیں اپنے حقوق شرعی طور پر حاصل کر سکے- اقبال عورتوں کی حقوق کے بارے میں بہت دلچسپی رکھتے تھے- انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ ہندوستان میں اسلامی قانون کی

عدالتیں قائم نہیں کی گئیں- فقہ اسلامی کے جامد ہونے کا بھی انہیں بہت افسوس تھا وہ عورتوں کے مسائل کے حوالے سے اجتہاد کو بہت ضروری سمجھتے تھے- وہ اسلامی شریعت کی روشنی میں, حقوق و فرائض کے حوالے سے معاشرے میں عورت کے مقام و مرتبہ اور منصب کا تعین کرتے ہیں- وہ چاہتے ہیں کہ عورتیں اپنے حقوق مردوں سے حاصل کر کے باوقار زندگی گزاریں- عورتیں تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو کر اپنے فرائض بھی احسن طریقے سے ادا کریں-

اقبال کا عورت کے لیے پیغام وہی ہے جو اسلام کی تعلیمات کے مطابق قرآن و حدیث میں ہے- انہوں نے زندگی کے کردار پر عورت سے وہی توقع کیا جو قرآن میں اس کے لیے مخصوص کیا گیا ہے- یہ حقیقت ہے کہ اقبال نے عورت کے زوجیت اور امومت کے فرائض کی ادائیگی پر زور دیا ہے جو قرآنی تعلیمات کے عین مطابق ہے- اقبال نے اسی فرض کو بطریق احسن نبھانے کے لیے عورت کی رہنمائی اپنے کلام کے ذریعے کی ہے-

اقبال کے افکار میں نظریہ امومت میں اولاد کی تربیت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے- اس ضمن میں وہ خواتین کو اس فریضے کی بہترین ادائیگی کی طرف توجہ دلاتے ہیں- نظریہ امومت کی تفہیم کے بعد اقبال کے ہاں "وجود زن" سے صرف "تصویر کائنات میں رنگ "ہی نہیں رہتا بلکہ افراد ملت کی تہذیب و تربیت میں متحرک کردار ادا کرتی خواتین دکھائی دیتی ہیں- اقبال نے عورت کے مقام و مرتبہ کی شناخت اور دریافت کے ضمن میں محض فرائض کی بات نہیں کی بلکہ وہ خواتین کے حقوق کے بارے میں اپنے شعری اور نثری کلام میں نگارشات پیش کرتے ہیں جن کا مطالعہ کئے بغیر اقبال کے نظام فکر میں عورت کے تصور کو سمجھنا ناانصافی ہو گی- اقبال کا بنیادی مقصد فرد اور معاشرے کی اصلاح ہے چنانچہ انہوں نے عورت کے مقام و مرتبہ کے ساتھ ساتھ اس کے صنفی مسائل پر بھی بات کی اور خصوصاً تصور زن کے موضوع پر تمام تر دینی و سماجی اور مشرقی تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے عورت کی عظمت اور اہمیت کی توضیح کی ہے- اقبال نسل انسانی کی بقا عورت کے وجود میں مضمر گردانتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں عورت کی عظمت کا احساس بہت قوی محسوس ہوتا ہے۔ وہ عورت کو ملتِ اسلامیہ کے ایک کلیدی نمائندے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں جس پر افراد قوم کی اصلاح اور فلاح منحصر ہے اور اسی تناظر میں انھوں نے عورت کو اپنا مقام و مرتبہ پہچاننے کی تلقین کی ہے۔ اقبال کے کلام و افکار میں دیگر فکری مضامین کی طرح ان کا پیش کردہ تصورِ نسواں بھی کتابِ حکمت سے اخذ شدہ ہے جسے انھوں نے ہندوستان کے سیاسی و سماجی ڈھانچے کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ علامہ محمد اقبال، "بانگ درا" مشمولہ کلیاتِ اقبال (اردو) (لاہور: الفیصل ناشران وتاجرانِ کتب، ستمبر ۲۰۱۲ء)، ص ۱۶۷۔

۲۔ علامہ محمد اقبال، "ضربِ کلیم" مشمولہ کلیاتِ اقبال (اردو)، ص ۴۸۸۔

۳۔ ایضاً، ص ۴۶۰

۴۔ علامہ محمد اقبال، جاوید نامہ "مشمولہ کلیاتِ اقبال (فارسی) (لاہور: نقوش پریس، اقبال اکادمی پاکستان، طبع اوّل، ۱۹۹۰ء)، ص ۵۴۱۔

۵۔ علامہ محمد اقبال، "رموزِ بے خودی" مشمولہ کلیاتِ اقبال (فارسی) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، طبع ششم) ص ۱۴۹۔

۶۔ صابر کلوروی (مرتبہ)، کلیات باقیات شعر اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع اوّل، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۶۴۔۱۶۵۔

۷۔ علامہ محمد اقبال، "بانگ درا" مشمولہ کلیاتِ اقبال (اردو)، ص ۷۳۔

۸۔ ایضاً، ص ۷۶۔

۹۔ ایضاً، ص ۷۹۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۸۹۔

۱۱۔ علامہ محمد اقبال، "بانگ درا" مشمولہ کلیاتِ اقبال، ص ۹۱۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۹۲

۱۳۔ ایضاً، ص ۹۳۔

۱۴۔ علامہ محمد اقبال، "بانگ درا" مشمولہ کلیاتِ اقبال (اردو)، ص ۱۶۷۔

۱۵۔ علامہ محمد اقبال، "جاوید نامہ" مشمولہ کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص ۵۴۱۔

۱۶۔ علامہ محمد اقبال، "رموزِ بے خودی" مشمولہ کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص ۱۵۹۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۸۲۹۔

۱۸۔ علامہ محمد اقبال، "ضربِ کلیم" مشمولہ کلیاتِ اقبال (اردو) (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۲۰۱۲ء)، ص ۴۶۲۔

۱۹۔ علامہ محمد اقبال، "ضربِ کلیم "مشمولہ کلیاتِ اقبال (اردو)، ص ۴۶۱۔
۲۰۔ علامہ محمد اقبال، "جاوید نامہ "مشمولہ کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص ۵۸۵۔
۲۱۔ علامہ محمد اقبال، "بانگ درا "مشمولہ کلیاتِ اقبال (اردو)، ص ۲۲۴۔
۲۲۔ علامہ محمد اقبال، "ضربِ کلیم "مشمولہ کلیاتِ اقبال (اردو) (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۲۰۱۲ء)، ص ۴۵۸۔
۲۳۔ علامہ محمد اقبال، "ضربِ کلیم "مشمولہ کلیاتِ اقبال (اردو)، ص ۴۶۰۔

باب سوم:

اقبال کے خطبات اور دیگر نثری تحریروں میں
خواتین کے مسائل کی تشریحات و توضیحات

باب سوم:

اقبال کے خطبات اور دیگر نثری تحریروں میں خواتین کے مسائل کی تشریحات و توضیحات

عصرِ جدید میں اسلامی معاشرے کو درپیش مسائل کی نوعیت گذشتہ کئی صدیوں کے مسائل سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اگر بات کی جائے مسائل کی نوعیت کی تو یہ تقریباً زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر معاشرتی، معاشی، سیاسی، اقتصادی سماجی اور تعلیمی مسائل کے ساتھ ساتھ حقوق نسواں کا مسئلہ بھی ایک اہم سماجی تحریک کی شکل اختیار کر گیا ہے یا یوں کہنا بے جانہ ہوگا کہ جب برصغیر کی معاشرت میں عورتوں کے حقوق کی پاسداری کا مسئلہ نازک موڑ پر پہنچ چکا تھا اور عورت کو معاشرتی حقوق کے حصول سے محروم رکھا جارہا تھا تو ایسے حالات میں مغرب میں عورتوں اور مردوں کے مساوی حقوق تفویض کیے جانے کی جدوجہد ایک تحریک کی شکل میں انیسویں صدی کے دوران ابھر کر سامنے آئی۔ حقوق نسواں کی اس تحریک کو تانیثیت کا نام دیا گیا جس کے اثرات برصغیر کی سماجی زندگی کے ساتھ ساتھ ادبی زندگی پر مرتب ہوئے۔ انیسویں صدی کے مختلف شعراء و ادباء نے اپنے شعری اور نثری کلام میں مرد و زن کی مساوات اور حقوق کے حصول کا ذکر کیا۔ انھی مفکرین کے ساتھ ایک ایسی شخصیت نے بھی اس مسئلے پر غور و فکر کرنا شروع کر دیا اور اس سلسلے مین عملی اقدامات اٹھانا بھی ضروری سمجھا اور یہ شخصیت علامہ اقبال کی ہے جو بنیادی طور پر ایک مفکر ہیں جن کی نظر ہر شعبۂ زندگی پر رہی۔ اقبال کی شاعری حکمت و فلسفے کا ایک خوبصورت پیرایہ ہے جب کہ ان کی نثری نگارشات جن میں گفت و شنید، تقاریر و مقالات اور مکاتیب و شذرات کے علاوہ علم الاقتصاد، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ اور ایران میں فلسفۂ الٰہیات کا ارتقا جیسی نادر کتب بھی اقبال کے تفکر کے حوالے سے اہم ہیں۔

اقبال نے اپنے پیش روؤں یا معاصرین کے برعکس اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہا ایک مربوط اور باضابطہ نظامِ فکر پیش کر کے کیا۔ انھوں نے انسانی حیات سے وابستہ مختلف امور پر اظہارِ خیال کیا اور خصوصاً اپنی شاعری میں فرد کی ذات، انسانی حیات اور جملہ امور حیات پر عالمانہ و فلسفیانہ نگاہ ڈالی جو اس سے پہلے ایسی صورت میں قطعاً دکھائی نہیں دیتی۔ نتیجتاً ہر طبقۂ زندگی کے لیے ان کی فکریات سے مستفید ہونے کے امکانات موجود ہیں۔ اقبال نے نثر و شعر میں اپنے پیغام و تفکر کا ابلاغ کرتے وقت تمام مسائل کی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تلقین کی اور عصری تقاضوں کے مطابق

معاشرتی و سماجی حقائق کو نئے تناظر کے مطابق پیش کیا۔

اسلام نے عورت کو مرد کے برابر حقوق چودہ سو سال پہلے ہی متعین کر دیئے تھے۔ جب عورت کے حقوق کا تصور ابھی دنیا کے کسی بھی معاشرے میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ مرد و عورت کی مساوات کا نظریہ دنیا میں سب سے پہلے اسلام نے پیش کیا اور اس طرح عورت کو مرد کی غلامی سے نجات دلائی جس غلامی میں عورت صدیوں سے جکڑی ہوئی تھی۔ اس مساوات کی بنیاد کتاب مبین کی اس تعلیم پر ہے جس میں فرمایا گیا کہ :

تم (مرد) ان (عورت) کے لیے لباس ہو اور وہ تمہارے لیے لباس ہیں۔

فکر انسانی کا سرچشمہ قرآن مجید ہے اور اس مقدس کتاب نے آدمؑ و حواؑ کے ذریعے عالم انسانی کے اشرف المخلوقات ہونے کی مشیت ایزدی کی حکمت بیان فرمائی اور عورت کے وہ حقوق بتائے جنہیں زمانۂ جاہلیت کا انسان اس عظیم کتاب کے نزول تک فراموش کر چکا تھا۔ در حقیقت دینِ اسلام نے طبقۂ نسواں کو وہ مقام و مرتبہ دیا جو اس صنفِ انسانی کو نہ تو پہلے کبھی ملا تھا اور نہ ہی آج تک مل سکا ہے۔ مفکر اسلام علامہ محمد اقبال کا عورت کے بارے میں نظریہ اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ وہ قرآن مجید کی روشنی میں عورت کو اس کے حقوق و فرائض کا احساس دلاتے ہیں اور دورِ جدید میں عصری تقاضوں کے مطابق معاشرے میں پیش آنے والی تبدیلیوں کے عورت کی ذات پر مرتسم ہونے والے مثبت و منفی اثرات سے اسے آگاہ کرتے ہیں۔

اقبال نسل انسانی کی بقا عورت کے وجود میں مضمر گردانتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں عورت کی عظمت کا احساس بہت قوی محسوس ہوتا ہے۔ وہ عورت کو ملتِ اسلامیہ کے ایک کلیدی نمائندے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں جس پر افراد قوم کی اصلاح اور فلاح منحصر ہے اور اسی تناظر میں انھوں نے عورت کو اپنا مقام و مرتبہ پہچاننے کی تلقین کی ہے۔ اقبال کے کلام و افکار میں دیگر فکری مضامین کی طرح ان کا پیش کردہ تصورِ نسواں بھی کتابِ حکمت سے اخذ شدہ ہے جسے انھوں نے ہندوستان کے سیاسی و سماجی ڈھانچے کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

اقبال نے اپنی مشہور تصنیف علم الاقتصاد میں برصغیر کے معاشرے کے مظلوم طبقوں کا ذکر کیا ہے۔ وہاں عورتوں کے حقوق کے بارے میں بھی لکھا ہے کہ جو حقوق قرآن و سنت میں اسے دیئے گئے تھے لیکن برصغیر کی عورتوں کو ان سے بھی محروم رکھا گیا ہے۔ اقبال نے اس معاشرے میں رہ کر عصرِ حاضر کی عورت کو درپیش مسائل اور ان کی حق تلفی، عدم استحکام، عورت کے متعلق تنگ نظری اور تعصبانہ رویوں کا ذکر اپنے کلام میں کیا ہے اور عورت کو اس کا مقام و عظمت اور بلند مرتبہ ہونے کا احساس بھی دلایا ہے۔

عورت کا تصور، افکار اقبال کی روشنی میں:

شعر و فکرِ اقبال میں عورت کا تصور ان کے دیگر نظریات کے مقابلے میں ادھورا دکھائی دیتا ہے لیکن اگر اس ضمن میں اقبال کے پیش کردہ تمام تر اشارات و نکات کو مرتب کیا جائے تو ایک ایسی مکمل تصویر بنتی ہے جس میں عورت سے وابستہ تمام تر رومانی و جمالیاتی، عقلی و استدلالی اور سماجی و تہذیبی پہلوؤں نے بہت خوبصورتی سے رنگ بھرے ہیں۔ فکرِ اقبال میں در حقیقت عورت سے متعلق تصورات، ان کے تمام مباحثِ فکر ہی کی طرح تدریجی صورت رکھتے ہیں۔

اقبال عورت کا مقام و عظمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عورت اور مرد کے دائرہ عمل مختلف ہیں اور ان دونوں صنفوں میں سے کسی کی بھی اہمیت کم نہیں ہے۔ وہ بہت خوبصورت پیرائے میں عورت کے مقام و مرتبہ کی اہمیت کو اپنے کلام میں بیان کرتے ہیں۔ جس طرح اسلام نے کتاب مبین میں جامع الفاظ اور نہایت بلیغ انداز میں عورت اور مرد کے ساتھ کو تمدن کی بنیاد قرار دیا ہے اور انہیں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر بتاتے ہوئے عورت کو بھی وہی تمدنی طور پر مقام و مرتبہ دیا ہے جو مرد کو حاصل ہے۔

نبی کریم ﷺ نے مرد و عورت کی تمدنی حیثیت کو یکساں قرار دیتے ہوئے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا۔

"عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرو۔ تمہارا عورتوں پر حق ہے اور عورتوں کا تم پر حق ہے"

آپ ﷺ کے اس خطبے میں بہت واضح انداز میں عورت کو مرد کے برابر اہمیت دی گئی ہے اور عورتوں پر مردوں کی کسی قسم کی برتری کا ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا تمدنی حیثیت سے عورت اور مرد دونوں اسلام کی نظر میں برابر ہیں اور دونوں صنفوں کو یکساں اہمیت حاصل ہے۔

اقبال اپنی فارسی نظم خلافت آدم مرد و عورت کی یکسانیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مرد و زن ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور ان کے باہمی رشتے کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کو اس لیے تخلیق کیا کہ ان سے افزائشِ نسل کا سلسلہ چلے اور قیامت تک نسل انسانی کا سلسلہ چلتا رہے۔ ترویج اور تولید کے اس عمل کو کائنات شوق سے اس لیے تعبیر کیا کہ حق تعالیٰ نے توالد اور تناسل کی۔ ان سے مرد و عورت میں محبت کا مادہ ودیعت کر دیا ہے۔ باہمی وابستگی کا نتیجہ یہ کائناتِ شوق کی صورت گری یعنی افزائشِ نسل انسانی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

دینِ اسلام ہی ایسا واحد مذہب ہے جو عورت اور مرد کو انسانیت کی بناء پر مساوی اور ایک وحدت قرار دیتا ہے

تاکہ وہ تمام غلط نظریات ختم ہو جائیں جو عورت کو مرد سے کم تر مخلوق بتاتے ہیں اور اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں اقبال عورت کے بارے میں نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں کہ اسلام صنفی تعلق کو فطری حقائق کی بنیاد پر قائم کرتا ہے اور پھر اس تعلق کے تمام نفسیاتی اور عملی پہلو بیان کرتا ہے تاکہ نہ کہیں اضطراب اور عدم استقلال رونما ہو اور نہ ہی مسئلہ کے کسی پہلو میں کوئی اخفاء باقی رہے۔

قرآن حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

"یاایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ و خلق منھا زوجھا و بث منھما رجالا کثیرا و نسآء" (النسآء، آیت نمبر ۱)

ترجمہ: "اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا ایک جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔"

علامہ اقبال جب یورپ سے تعلیم حاصل کر کے ہندوستان واپس لوٹے تو وہ مغربی تعلیمی، سماجی، معاشی اور سیاسی صورت حال سے بخوبی واقف تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں پورے یورپ میں عورتیں تعلیم، سیاسی نمائندگی، صحت، جنسیت، مادریت، قانونی حقوق اور کچھ علاقائی حقوق سے متعلق پرچار کر رہی تھیں اور ایسے وقت میں خواتین کے حقوق اور ان کی بیداری کے لیے آگاہی فراہم کرنے کے لیے مختلف اہم رسالے اور کتب منظرِ عام پر آتی رہیں تھیں۔ مغربی مفکرین اس موضوع پر زور و شور سے آواز بلند کر رہی تھیں۔

ایسے حالات میں اقبال ان تمام مغربی تحریکات، تخلیقات اور عملی اقدامات سے بخوبی واقف تھے۔ مشرقی عورت کے حالات خصوصاً مسلمان عورت کا جو طرزِ زندگی تھا وہ اس سے بھی تو ناواقف نہ تھے۔ لہٰذا ان حالات میں اور مغربی تانیثی تحریک کے تناظر میں اقبال کا تصورِ نسواں قابل توجہ ہے۔ ان کے کلام اور مختلف تحریروں میں عورت کا مقام و مرتبہ اور اس کا منصب زندگی جابجا ملتا ہے۔

۱۹۲۸ء کے اواخر میں علامہ اقبال مسلمانانِ مدراس کی دعوت پر جنوبی ہند کے دورے کے لیے گئے۔ اپنے اس دورے میں انھوں نے وہ مشہور و معروف تین لیکچرز دیئے جو بعد میں تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے نام سے شائع ہوئے۔ ۷ جنوری ۱۹۲۹ء کو مدراس میں انجمن خواتین مدراس کی طرف سے ایک تقریب میں علامہ اقبال نے شرکت کی اور مسلم خواتین مدراس کے سپاسنامہ کے جواب میں ایک بصیرت افروز تقریر کی۔ اپنی اس تقریر میں اقبال نے اسلام میں عورت کا مقام اسلامی شریعت میں عورت اور مرد کے حقوق پر روشنی ڈالی۔ یہاں ان کی تقریر بعنوان "شریعتِ اسلام میں مرد اور عورت کا رتبہ" سے ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

میرا یہ عقیدہ رہا ہے کہ کسی قوم کی بہترین روایات کا تحفظ بہت حد تک اس قوم کی عورتیں ہی کر سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی وجوہ ہیں جن کی بنا پر میں آپ کے ایڈریس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اگر انحطاط کے دور میں عورت کے حقوق سے بے پروائی ہوئی، مسلمان مردوں نے مسلمان عورتوں سے تغافل برتا لیکن عورت باوجود اس تغافل کے اپنا منصب پورا کرتی رہی۔۔۔۔[1]

اقبال معاشرے کے استحکام اور ایک بہترین تعمیر و تشکیل کے لیے عورت کی اہمیت کے قائل ہیں لیکن ایک سوال جو مرد اور عورت کی مساوات میں اختلاف پیدا کرتا ہے کہ مرد و زن کے تعلق میں بالادستی کسے حاصل ہو۔ اس لیے کہ دنیا کا کوئی بھی تعلق ہو اس میں کوئی ایک فریق شریک غالب کی حیثیت ضرور رکھتا ہے اور یہ اس کائناتی حقیقت پر مبنی ہے کہ ہر شے اور ہر انسان ایک دوسرے کا محتاج ہے۔ ہر ایک، دوسرے کی تکمیل کرتا خصوصاً مرد و زن کے تعلقات میں چند پہلوؤں میں مرد کو عورت پر فضیلت اور اوّلیت حاصل ہے اور یہ بھی کسی نسلی اور صنفی تفریق کی بنا پر نہیں بلکہ خود عورت کے حیاتیاتی، عضویاتی فرق اور فطرت کے لحاظ کے ساتھ اس کے حقوق و مصالح کی رعایت کے پیشِ نظر ہے۔

اس کے علاوہ علامہ اقبال نے اپنی دوسری تحریروں اور اپنے ایک مشہور لیکچر ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر علی گڑھ ۱۹۱۱ء میں تصور نسواں کی وضاحت کی۔ اقبال کی پہلی تصنیف علم الاقتصاد اگرچہ ایک مخصوص موضوع سے بحث کرتی ہے مگر اس میں بعض جگہ ضمناً عورت کا ذکر آیا ہے۔ اس تصنیف میں اقبال نے جہاں معاشرے میں مظلوم طبقوں کا ذکر کیا ہے وہیں عورتوں کے حقوق کے بارے میں بھی لکھا کہ جو حقوق قرآن و سنت میں عورت کو دیئے گئے تھے، برصغیر میں انہی حقوق سے عورتوں کو محروم رکھا گیا ہے۔

اقبال کے ابتدائی مقالات میں قومی زندگی، ۱۹۰۴ء مسئلہ حقوق نسواں کے متعلق ایک نہایت ہی گراں قدر مضمون ہے۔ اپنے اس مضمون میں اقبال نے لکھا ہے کہ:

اصلاح تمدن کے ضمن میں سب سے زیادہ نازک مسئلہ حقوقِ نسواں کا ہے۔ مغربی علماء نے حقوق نسواں کے متعلق مذہب اسلام پر بعض بڑے بے جا اعتراض کیے ہیں لیکن یہ اعتراض حقیقت میں مذہب اسلام پر نہیں ہیں۔۔۔۔ بلکہ ان کی آماجگاہ واستدلات ہیں جو فقہائے اسلام نے کلامِ الٰہی کے وسیع اصولوں سے لیے ہیں اور جن کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ فردی اجتہادات مذہب کے ضروری اجزاء نہیں ہیں۔[2]

عورت کے حقوق و فرائض۔ افکارِ اقبال کی روشنی میں:

قرآن و سنت سے یہ بات واضح ہے کہ اسلام نے عورت کو وہ تمام حقوق دے رکھے ہیں جو عورت کی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ اقبال کی شاعری کا منبع و مرکز قرآن و سنت ہے مگر خواتین کے متعلق اقبال کے جو تصورات ہیں وہ اسلامی تصورات کے ساتھ ایک مشرقی عورت کے روایتی طرزِ زندگی کے ساتھ گھل مل گئے ہیں۔

فکریاتِ اقبال میں عورت کے مقام و مرتبے کی شناخت اور دریافت کے ضمن میں قابلِ قدر نکتہ یہ ہے کہ اقبال نے محض فرائض کی بات نہیں کی بلکہ وہ حقوقِ نسواں کے خاصے داعی رہے۔ ان کی نثری و شعری نگارشات میں اس ضمن میں بڑے نادر خیالات کا اظہار ملتا ہے جن کا مطالعہ کیے بغیر اقبال کے نظامِ فکر میں عورت کے تصور کو سمجھنا محال ہے۔

اقبال حقوقِ نسواں کی پُرزور حمایت کرتے ہوئے اور عورت کو اپنے حقوق کا احساس دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ مغرب میں اٹھائے جانے والے آزادیٔ نسواں سے متعلق خیالات کا اطلاق خود پر بغیر سوچے سمجھے اور اپنے مذہب اور اقدار کے آئینے میں انہیں پرکھے بغیر کر رہی ہیں۔ حالانکہ دینِ اسلام نے عورت کو ایک فرد کے طور پر اہمیت دی ہے اور عورتوں کے حقوق پر واضح احکامات قرآن حکیم میں موجود ہیں۔

بحیثیت انسان اسلام میں مرد و عورت برابر ہیں لیکن جب بات کی جائے حقوق و فرائض کی تو عورت اور مرد کے واجبات کی ادائیگی اور حقوق و فرائض الگ الگ ہیں۔ اسلام نے عورتوں کو مردوں کے مساوی نہیں بلکہ مردوں سے زیادہ حقوق دیئے ہیں۔

علامہ اقبال اصلاحِ تمدن کے ضمن میں بیان کردہ مسائل میں عورت کے حقوق کو اہم مسئلہ گردانتے ہیں اور وہ حقوقِ نسواں کو سب سے زیادہ نازک مسئلہ کہتے ہیں اور اس سلسلے میں واضح اسلامی احکامات کی موجودگی کی طرف توجہ دلانے کے ساتھ ساتھ اسلام میں عورتوں کے حقوق پر روشنی ڈالتے ہیں۔

اقبال اپنے مضمون قومی زندگی میں اس حوالے سے مغرب کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے بڑے مدلل اسلوب میں لکھتے ہیں:

> مغربی علما نے حقوقِ نسواں کے متعلق مذہب اسلام پر بعض بڑے بے جا اعتراض کیے ہیں، لیکن یہ اعتراض حقیقت میں مذہب اسلام پر نہیں ہیں۔ جیسا کہ ان علما نے خیال کیا ہے، بلکہ ان کی آماجگاہ وہ استدلات ہیں جو فقہائے اسلام نے کلامِ الٰہی کے وسیع اصولوں سے کیے ہیں اور جن کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ ضروری اجتہادات مذہب کے کوئی ضروری اجزا نہیں ہیں۔۔۔۔[۳]

فکریاتِ اقبال میں فرائض کے اختلافات کے ساتھ بطور فرد عورت کو مرد کے مساوی قرار دیا گیا ہے اور اقبال واضح طور پر اس طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ۷ جنوری ۱۹۲۹ء کو انجمن خواتین اسلام، مدراس نے علامہ اقبال کو ایک سپاس نامہ پیش کیا جس میں انہوں نے برعظیم میں مسلم عورت کے استحصال پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ:

> آپ سے یہ عاجزانہ التماس کرنا غیر موزوں اور نامناسب نہ ہوگا کہ آپ ہم اسیرانِ قفس کے لیے بھی اپنے قیمتی اوقات سے کچھ تھوڑا سا وقت وقف فرمائیں اور طبقہ نسوانِ اسلام کی شرعی آزادی کے لیے نغمہ سنجی فرمائیں۔ ہم اسیرانِ قفس کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اس کے انسداد کے لیے کوئی ایک پُرجوش نظم لکھ کر سوتے ہوئے جذبات کو بھڑکایئے۔۔۔۔[۴]

مدراس میں پیش کیے گئے سپاس نامہ کے جواب میں اقبال نے "شریعتِ اسلام میں مرد اور عورت کا رتبہ" کے عنوان سے ۱۹ فروری ۱۹۲۹ء کو ایک تقریر کی جو انقلاب میں شائع ہوئی۔ اس میں آزادیٔ نسواں سے متعلق دیگر نکات کے علاوہ عورت اور مرد کی مساوات کے ضمن میں اقبال نے فرمایا۔

> عورت کے بحیثیت عورت اور مرد کے بحیثیت مرد، بعض خاص علیحدہ علیحدہ فرائض ہیں۔ ان فرائض میں اختلاف ہے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ عورت ادنیٰ ہے اور مرد اعلیٰ۔ فرائض کا اختلاف اور وجوہ پر مبنی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک مساوات کا تعلق ہے، اسلام کے اندر مرد و زن میں کوئی فرق نہیں تمدنی ضروریات کی وجہ سے فرائض میں اختلاف ہے۔ مدنی زندگی کے لیے جو احکام ہوں گے، وہ فرائض کو مدنظر رکھ کر ہوں گے۔[۵]

اسی ضمن میں مدراس میں خواتین کے سپاس نامے کے جواب میں اقبال نے اسلام میں عورت اور مرد کے حقوق اور اسلامی شریعت میں عورت کے مقام و مرتبے پر روشنی ڈالی اور اپنے آثار و تصانیف میں عورت کے بارے میں جملہ امور واضح کیے۔ یوں تو عورتیں اکثر کام بخیر و خوبی انجام دے سکتی ہیں مگر مرد و زن کے جو فطری وظائف ہیں، ان پر دونوں اصناف کو زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ فطرت سے ہم آہنگی اور مساعدت سے انسانوں کی توانائیوں اور ان کی کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسی ضمن میں اقبال فرماتے ہیں کہ:

> ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اگر میری تحریروں نے خواتین کے دلوں میں اسلامی روایات کا احترام پیدا کیا ہے تو رب کعبہ کی قسم، میں سمجھتا ہوں کہ میں اپنی مراد کو پہنچ گیا۔ میرا یہ عقیدہ رہا ہے کہ کسی قوم کی بہترین روایات کا تحفظ بہت حد تک اس قوم کی عورتیں ہی کر سکتی ہیں۔۔۔[۶]

اقبال عورت کا مقام و عظمت اور اتنی اہمیت بیان کرنے کے باوجود کہتے ہیں کہ عورت اور مرد کے دائرہ عمل مختلف ہیں اور دونوں اصناف میں سے کسی کی بھی اہمیت کم نہیں ہے اور تمدنی ترقی اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب معاشرے کے دونوں ارکان باہمی تعاون سے کام لیں۔

اسلام اور صنفی مساوات۔افکارِ اقبال کی روشنی میں:

اسلام میں مردوں اور عورتوں کو تمام معاشرتی اور تمدنی حقوق یکساں طور پر حاصل ہیں۔ قرآن حکیم کی مختلف آیات اس حقیقت کو وضاحت سے بیان کرتی ہیں

ترجمہ: "اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور پھر ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔" (النساء)

اس آیت مبارکہ میں اس بات کا اعلان ہے کہ دنیا کے بے شمار مرد اور عورتیں ایک ہی ماں باپ کی اولاد اور ایک ہی کل کے اجزاء ہیں. نہ تو مرد اس لیے باعزت ہے کہ وہ مرد ہے اور نہ عورت کا عورت ہونا کمتر ہونے کا باعث ہے.

بنیادی انسانی حقوق میں صنفی مساوات کے حوالے سے ایک اور پالیسی ساز آیت کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"عورتوں کے بھی معروف طریقے سے ویسے ہی حقوق ہیں جیسے حقوق مردوں کے ہیں" (البقرہ-۲۲۸)

اسلام میں صنفی مساوات کا ایک اور پہلو یہی ہے کہ بحیثیت انسان اعمال اور انکی قبولیت کا دار و مدار کسی حسب نسب یا صنفی برتری کے حوالے سے نہیں ہے. قرآن مجید کی ایک اور سورت الاحزاب میں بھی مرد اور عورت کو اپنے اعمال کی بنا پر اجر کا مستحق قرار دیتے ہوئے اس امر کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ اخلاقی لحاظ سے مرد و عورت میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ حقوق، اطاعت، بندگی، عبادت اور تعلقات زوجین وغیرہ جیسے تمام معاملات میں فیصلہ کن جنس/صنف نہیں بلکہ اللہ کے احکامات کو تسلیم کرنا اور ان پر عمل کرنا ہے۔

اسلام مرد اور عورت کے درمیان یکساں معاشرتی و تمدنی حقوق کی ضمانت دیتے ہوئے ان کے مابین فرائض کی تقسیم کار کا تعین کرتا ہے اور اس تقسیم کار کی بنیاد پر دونوں اصناف کے کچھ حقوق اور ذمہ داریاں مختلف بھی ہو جاتی ہیں۔ یہ تمام تعلیمات اس کائناتی حقیقت پر مبنی ہیں کہ ہر انسان ایک دوسرے کا محتاج ہے اور ہر شے ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہے اور اس طرح سب کو یکساں اہمیت حاصل ہوتی ہے لیکن باوجود ان دونوں اصناف کی یکسانیت کے، دنیا کا کوئی تعلق ہو تو اس میں ایک فریق کو کچھ نہ کچھ غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ ایک فطری اصول ہے اور اسی بناء پر چند چیزوں میں مرد کو عورت پر برتری اور فضیلت حاصل ہے۔ اس کی وجہ حیاتیاتی اور عضویاتی فرق بھی ہے اور فطرت کے لحاظ سے حقوق و مصالح کی رعایت بھی ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم نے مرد کو عورت پر نگران اور قوامیت کی فوقیت دی ہے۔ مگر دوسری جانب اسلام ہی نے عورت کو یہ عظمت بخشی ہے کہ جنت کو ماں کے قدموں تلے بتایا ہے۔ گویا کچھ باتوں میں اگر مرد کو فوقیت حاصل ہے تو تخلیقی فرائض میں عورت کو بھی فوقیت حاصل ہے۔

اس ضمن میں اقبال شریعتِ اسلام میں مرد اور عورت کا رتبہ کے عنوان سے اپنی ایک تقریر میں فرماتے ہیں کہ :

> مجھے یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ اسلام میں مرد وزن میں قطعی مساوات ہے۔ میں نے قرآنِ پاک کی آیت سے یہی سمجھا ہے۔ بعض علماء مرد کی فوقیت کے قائل ہیں۔ جس آیت سے شک کیا جاتا ہے، وہ مشہور ہے الرجال قوامون علی النساء۔ عربی محاورے کی رو سے اس کی یہ تفسیر صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ مرد کو عورت پر فوقیت حاصل ہے۔ عربی گرامر کی رو سے قائم کا صلہ جب علیٰ پر آئے تو معنی محافظت کے ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسری جگہ قرآن حکیم نے فرمایا: ھن لباس لکم وانتم لباس لھن۔ لباس بھی محافظت کے لیے ہوتا ہے۔ مرد، عورت کا محافظ ہے۔ دیگر کئی لحاظ سے بھی مرد و عورت میں کسی قسم کا فرق نہیں۔۔۔۔[۷]

اقبال نے اسی تقریر میں اپنے موقف کی تائید میں تاریخِ اسلام سے اسناد پیش کرتے ہوے عورت اور مرد کی مساوات کے حوالے سے یہ بھی کہا ہے کہ :

> قرونِ اولیٰ میں عورتیں مردوں کے دوش بہ دوش جہاد میں شریک ہوئیں۔ حضرت عائشہؓ پردے میں بیٹھ کر لوگوں کو درس دیتی رہیں۔ خلفائے عباسیہ کے عہد میں ایک موقعے پر خلیفہ کی بہن قاضی القضاۃ کے عہدے پر مامور تھیں اور خود فتویٰ صادر کرتی تھیں۔ اب یہ مطالبہ ہے کہ عورت کو ووٹ کا حق ملنا چاہیے۔ خلافتِ اسلامیہ میں خلیفہ کے انتخاب پر ہر شخص کو رائے دینے کا حق حاصل تھا، نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی خلیفہ کے انتخاب میں اپنی آواز رکھتی تھیں۔ اسلام تمام معاملات میں اعتدال کو مدِ نظر رکھتا ہے۔ امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ تمام افراط و تفریط سے پرہیز کیا جائے۔[۸]

چونکہ اسلام مرد و عورت کے درمیان یکساں معاشرتی و تمدنی حقوق کی ضمانت دیتے ہوے ان کے مابین فرائض کی تقسیم کار کا تعین کرتا ہے، اس لیے اس تقسیم کار کی بنیاد پر دونوں اصناف کے درمیان سب سے اہم تقسیم خاندان کے ادارے کے نظم و نسق کے حوالے سے سامنے آتی ہے۔ مرد اور عورت کے اشتراک کے وجود میں آنے والا ادارہ خاندان ہے جو کہ معاشرے کی بنیادی اکائی ہے۔ خاندان کے نظم و نسق کو چلانے اور اس کے مقاصد کے حصول کے لیے، ہر ادارہ کی طرح مختلف عہدہ داران کی ذمہ داریوں کا تعین کر دیا گیا ہے۔ مرد کو خاندان کے ادارے میں قوام / نگران کی حیثیت دی گئی ہے۔

ترجمہ: "مرد عورتوں کے نگران سرپرست ہیں۔" (النساء: ٣٤)

فکریاتِ اقبال میں طبقۂ نسواں سے متعلق تصورات و نظریات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقبال نے بھی عورت

کو دیگر علماء فلاسفہ کی طرح حیات انسانی کے ایک اہم اور فعال مظہر کے طور پر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کا بنیادی مقصد فرد اور معاشرے کی اصلاح و فلاح ہے اور انھوں نے خاص اس موضوع پر تمام تر دینی و سماجی اور مشرقی تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے عورت کے مقام و مرتبہ کی توضیح کی ہے۔ اگر عورت اپنے حقوق کو اسلامی و شرعی قوانین کی روشنی میں سمجھ پائے تو وہ مسلم معاشرے کی خودداری اور احساسِ ذمہ داری میں اضافے کا باعث بن سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ مسلم میں بہت سی ذمہ دار اور فعال مسلم خواتین کا تذکرہ نمایاں طور پر ملتا ہے جو یقیناً ہر دور کی مسلم خواتین کے لیے مثالی حیثیت رکھتی ہیں۔

اقبال کا تصورِ امومت:

عورت ایک ایسا موضوع ہے جس پر ہر دور کے اہم مفکرین نے اپنے اپنے انداز میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے عورت کی حیثیت اور مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں اردو شاعری میں عورت صرف محبوب کی نظر سے دیکھی جاتی تھی اور اس کی حیثیت صرف محبوبیت تک محدود تھی اور شاعر اسے اپنی شاعری میں اسی نکتے کی بنا پر استعمال کرتے تھے۔ وہیں اقبال کے عورت پر مبنی شاعری اور افکار ابھر کر سامنے آتے ہیں، جس میں عورت کو صحیح معنوں میں اجاگر کیا گیا۔ اقبال نے صنفِ نازک کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اس کی بنیاد قرآن و حدیث ہے اور اسلام ہی ایسا واحد مذہب ہے جس نے عورت کو ایک خاص مقام و عظمت اور بلند مرتبے سے نوازا ہے۔

اقبال نے مسلمان عورت کو بحیثیت ماں رحمت قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ اسے نبوت سے ایک خاص نسبت ہے اس کی شفقت میں پیغمبری پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہ بھی نبی کی طرح قوم کی صورت گری کرتی ہے۔ انہیں بناتی سنوارتی اور استحکام بخشتی ہے۔ وہ اپنی تربیت سے آئندہ نسلوں کی سیرت تعمیر کرتی ہے۔ قوم کی تعمیر اسی سے پختہ تر ہوتی ہے۔ اس کی پیشانی پر قوم کی تقدیر کے خدوخال ہوتے ہیں اور ان ہی کی ہمت سے تو ملت کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے۔ قوم کی تعمیر کا انحصار ماؤں کی تعلیم و تربیت پر ہوتا ہے۔ افراد قوم کو وہی مائیں اخلاق و عمل کی خوبیوں سے سرفراز کر سکتی ہیں جو خود اخلاق و کردار سے آراستہ ہوں۔

کلامِ اقبال میں جہاں مختلف موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے، وہاں اقبال نے کائنات کی حسین ہستی عورت کا بھی مختلف مقامات پر ذکر کیا ہے اور جگہ جگہ ان کے الفاظ میں عزت و احترام کے پاکیزہ جذبات دیکھنے میں آئے ہیں۔ صنفِ نازک کے بارے میں اقبال کے نظریات ان کے نظامِ فکر کا ایک اہم حصہ ہیں جو انہوں نے سارے سماج کے بارے میں پیش کیے ہیں۔ بقول جگن ناتھ آزاد:

یہ ایک حقیقت ہے کہ اقبال نے سماج کے ایک مضبوط کردار پر زور دیا ہے اور اس مضبوط کردار کے سارے قلعے کا سنگِ بنیاد اقبال نے عورت کے کردار کو قرار دیا ہے۔[9]

اقبال کے عورت کے بارے میں تصورات اسلامی تعلیمات پر مبنی ہیں۔ وہ مشرقی زندگی پر سب سے زیادہ توجہ دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ خاندانی نظام میں امومت کا کردار سب سے اہم اور مرکزی کردار ہے۔ اقبال عورت کا تصور امومت کے حوالے سے قائم کرتے ہیں اور اس سلسلے میں ماں کی عظمت اور کردار پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ تاریخ مسلم سے بطور خاص اطفال کی اعلیٰ تعلیم و تربیت پر مبنی نمایاں مثالیں پیش کرنے والی ماؤں کی نظائر فراہم کرتے ہیں۔ اس مقام پر عورت، رومانی و ذہنی سطح سے یک سر اوپر اٹھ کر معاشرے کے ایک اہم ستون کی حیثیت سے اپنی پہچان کراتی ہے۔

اقبال کے نزدیک عورت کی عظمت کا راز اس کے فرض امومت میں پنہاں ہے۔ اسلامی تاریخ میں عورت فریضہ اُمومت اور تربیت انجام دینے کے ساتھ ساتھ معاشرتی سطح پر بھی فعال رہی۔ مسلم خواتین اپنی نسوانی حیا کو برقرار رکھتے ہوئے نہ صرف جہاد میں شریک رہیں بلکہ اپنی علمیت و ذہانت کو بروئے کار لاتے ہوئے مختلف مدارس میں درس دیتیں۔ تاریخ اسلامی میں اقبال نے بار بار حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی مثال دی ہے جنہوں نے حضرت امام حسینؓ کی پرورش کی اور انہیں تاریخ اسلام کی سب سے بڑی انقلابی قربانی دینے کے قابل بنایا۔ ان کے نزدیک حضرت فاطمۃ الزہراؓ تین بلند پایہ نسبتوں کا مرکز ہیں۔ پہلی نسبت عظیم المرتبت نبی ﷺ کی بیٹی، دوسری نسبت حضرت علیؓ جیسے جلیل القدر انسان کی بیوی اور امام الشہدا حضرت امام حسین کی ماں۔ تمام دنیا کی تاریخ کو ٹٹولیے۔ اس قسم کی تین نسبتیں ایک عورت میں کبھی جمع نہ پاؤ گے،

علامہ اقبال، حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی ذات کو بطور نمونہ پیش کرتے ہوئے مسلم خواتین کے لیے اسوۂ بتولؓ کو مشعلِ راہ قرار دیتے ہیں۔ اقبال عورت کے اعلیٰ سیرت و کردار کو تمدن کی جڑ قرار دیتے ہوئے اپنے مضمون قومی زندگی میں رقم طراز ہوتے ہیں۔

> عورت حقیقت میں تمام تمدن کی جڑ ہے۔ ماں اور بیوی دو ایسے پیارے لفظ ہیں کہ تمام مذہبی اور تمدنی نیکیاں ان میں مستتر ہیں۔ اگر ماں کی محبت میں حبِ وطن اور حبِ قوم پوشیدہ ہے، جس میں سے تمام تمدنی نیکیاں بطور نتیجے کے پیدا ہوتی ہیں تو بیوی کی محبت اس سوز کا آغاز ہے جس کو عشق الٰہی کہتے ہیں۔[10]

حیات و فکریاتِ اقبال سے متعلق واقعات اور پیش کردہ کلام سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ اقبال کے ہاں وجودِ زن سے متعلق پہلا نمایاں زاویہ عورت کے ایک جمالیاتی و ذہنی اور عقلی و استدلالی تصور کے ساتھ وابستہ ہے جہاں

عورت کائنات کا ایک اہم عنصر ٹھہرتی ہے اور اس کائنات کی تمام تر رنگینیوں اور رعنائیوں کا باعث عورت ہی ہے۔ جب کہ عورت کے تصور کے ضمن میں دوسرا زاویہ امومت سے وابستہ ہے جسے اقبال نے نسبتاً زیادہ اہمیت دی اور جو حقیقتاً فرائض نسواں سے منسلک ہے۔ اقبال سمجھتے ہیں کہ عورت کائنات کی روحِ رواں اسی سبب سے ہے کہ وہ ایسے گراں قدر فرائض انجام دیتی ہے جو اسی کا خاصہ ہیں۔ یہ ذمے داریاں عورت بحیثیت ماں کے نبھاتی ہے اور تربیت اطفال کے تمام مراحل سے اسے قرآن وسنت کی روشنی میں بطریقِ احسن گزرنا چاہیے۔

اقبال کہتے ہیں کہ امومت اور تربیتِ اطفال عورت کی زندگی کا حاصل ہے جو در حقیقت حیاتِ انسانی ہی کی بقاو تربیت ہے۔ ماں کی گود بچے کی اولین درس گاہ ہے، اس لیے عورت کو امومت کے منصب سے کسی طور پر گریز نہیں کرنا چاہیے۔ عورت کو لذت تخلیق سے آشنا رہنا چاہیے اور اس راہ میں اپنی ذات سے وابستہ ترقی کو قربان کر دینا چاہیے۔ ماں کے قدموں تلے جنت اس لیے ہے کہ وہ اپنی ذات کو پسِ پشت رکھ کر بچے کی نگہ داری کرتی ہے۔ اسی ضمن میں اقبال اپنی کتاب علم الاقتصاد کے پہلے باب میں "علم الاقتصاد کی ماہیئت اور اس کا طریق تحقیق" کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں کہ:

> اس ماں کی خدمات بھی دائرہ علمِ اقتصاد سے خارج ہیں جو اپنے بیمار بچے کی حفاظت میں بعض دفعہ جان بھی دے دیتی ہے کیونکہ اس کی بناذاتی تاثرات یا محبت پر ہے۔۔۔۔[11]

چنانچہ اقبال کی نثر ہو یا شاعری، وہ عورت کو اس کی ذمہ داری کا احساس دلاتے ہیں۔ اس سلسلے میں اقبال کے بیانات بڑے دوٹوک ہیں۔ وہ عہدِ حاضر کے تقاضوں میں عورت کو اپنا اولین منصب اور فریضہ پہچاننے کی تلقین یوں کرتے ہیں:

> عورت پر قدرت نے اتنی اہم ذمہ داریاں عائد کر رکھی ہیں کہ اگر وہ ان سے پوری طرح بھی عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے تو اسے کسی دوسرے کام کی فرصت ہی نہیں مل سکتی۔ اگر اسے اس کے اصلی فرائض سے ہٹا کر ایسے کاموں پر لگا دیا جائے جنہیں مرد انجام دے سکتا ہے تو یہ طریقِ کار یقیناً غلط ہو گا، مثلاً عورت کو جس کا اصل کام آئندہ نسل کی تربیت ہے، ٹائپسٹ یا کلرک بنا دینا نہ صرف قانونِ فطرت کی خلاف ورزی ہے بلکہ انسانی معاشرے کو درہم برہم کرنے کی افسوس ناک کوشش ہے۔[12]

یہی وجہ ہے کہ جہاں اقبال عورت کا جدید روپ دیکھتے ان کے خیالات منتشر ہو کر رہ جاتے۔ فقیر سید وحید الدین اسی ضمن میں "روزگارِ فقیر" میں ایک واقعے کا ذکر کرتے ہیں کہ قیامِ لندن کے دوران اقبال نے سیلز گرل سے جرابیں دکھانے کو کہا، وہ لڑکی تیزی سے سامان لینے گئی، واپس آئی تو اقبال پر استغراق کا عالم تھا، وہ اس لڑکی سے پوچھنے لگے: تم یہاں کس لیے کھڑی ہو؟ وہ آبدیدہ ہو کر بولی کہ گھر کی آمدنی قلیل ہے اس میں اضافے کے لیے مجبوراً نوکری

کر رہی ہوں۔ بعد ازاں اقبال کے دوست سید امجد علی نے اقبال سے پوچھا کہ آپ نے آخر میں یہ سوال کیوں کیا، تو اقبال جواباً گویا ہوئے کہ اس خاتون کو تو کسی گھر کی روشنی بننا تھا۔ اولاد کی صحیح تربیت کا فرض انجام دینا تھا۔ اس کی تخلیق کا مقصد بازار کی رونق بن کر جرابیں فروخت کرنا تو نہیں تھا۔

فکریاتِ اقبال میں عورت کے مقام و مرتبہ کی شناخت اور دریافت کے ضمن میں قابلِ قدر نکتہ یہ ہے کہ اقبال نے عورتوں کے محض فرائض کی بات نہیں کی بلکہ وہ حقوقِ نسواں کے بھی خاصے داعی رہے اور فرائض نسواں کے مقابلے میں حقوق نسواں کو زیادہ توجہ دیتے نظر آتے ہیں بلکہ وہ تو اس معاملے میں خود عورت سے گلہ گزار ہیں کہ اسے اپنے حقوق کا احساس نہیں ہے۔ اقبال مزید اس بارے میں کہتے ہیں کہ مشرقی عورت مغرب میں اٹھائے جانے والے آزادی نسواں سے متعلق خیالات کا اطلاق خود پر بغیر سوچے سمجھے اور اپنے مذہب اور اقدار کے آئینے میں انہیں پرکھے بغیر کر رہی ہے۔ حالانکہ مذہبِ اسلام نے انہیں ایک فرد کے طور پر اہمیت دی ہے اور ان کے حقوق پر واضح احکامات موجود ہیں۔

دینِ اسلام عورت کی آزادی، مساوات، عظمت اور انفرادیت کا قائل ہے۔ چنانچہ اسلام کے یہ تصورات اقبال کے ہاں بھی موجود ہیں۔ اسلام نے عورت کو وہی حقوق دیئے ہیں جو مرد کو دیئے گئے ہیں۔ لیکن اسلام مرد اور عورت کے نفسیاتی اور جسمانی تقاضوں کو ملحوظ رکھتا ہے۔ اسلام دونوں کی فطرت اور نفسیات کے مطابق آزادی اور مساوات عطا کرتا ہے جبکہ مغربی تہذیب اور مغربی تحریکِ نسواں نفسیاتی و جسمانی تقاضوں کو نظر انداز کر کے یہ آزادی اور مساوات حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے جو فطرت کے خلاف ہے۔ بلاشبہ اسلام عورت کی ترقی کے خلاف نہیں ہے لیکن ان بعض اصولوں کے یقیناً خلاف ہے جو مغربی تہذیب اور آزادئ نسواں کی تحریک اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اختیار کر رہی ہے۔

اسی ضمن میں ڈاکٹر طالب حسین سیال اپنے مقالے اقبال اور انسان دوستی میں لکھتے ہیں کہ:

> دورِ حاضر میں عورت اور مرد کو الگ الگ اور آزاد اشخاص کی حیثیت سے دیکھا جا رہا ہے۔ ان کا یہ نعرہ ہے کہ عورت کو ماں، بہن، بیٹی کی حیثیت سے دیکھو اس تصور نے بلاشبہ عورت کو ایک نیا اعتماد بخشا ہے، اس کو معاشی انحصار سے نکال کر ایک آزاد اور فعال معاشی شخصیت کا درجہ دیا ہے لیکن عورت کی اس معاشی آزادی، آزاد خیالی حیثیت سے خاندانی نظام بڑا متاثر ہوا ہے۔ [۱۳]

اقبال اپنے روشن خیال اور معتدل انداز سے مغربی تہذیب کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے صحت مند اور غیر صحت مند پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جدید مغربی تہذیب، جس نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے، تہذیب و تمدن کے بنیادی شعبہ خاندان پر بھی اپنے دور رس اثرات مرتب کیے ہیں۔ مغربی تہذیب نے عورت کو نہ جانے کتنی ہی

غلامیوں اور مشکلات سے نجات دلائی ہے لیکن اس کے باوجود عورت کی یہ آزادی خود عورت پر اور اس کے ساتھ تہذیب و تمدن پر ایک انوکھے استبداد کی صورت میں ابھری ہے جسے اسلامی معاشرے بجا طور پر چیلنج کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

عورت کی آزادی جو مغربی تہذیب کا شاخسانہ ہے اسی سے پاکیزہ امومت سے محرومی کا سلسلہ وابستہ ہے۔ مغربی تہذیب کی اس بے جا آزادی نے عورت کو اس کے فطری جوہر اور عظمت سے محروم کرنے کی کوشش کی ہے۔ تحریکِ آزادئ نسواں کے اس پہلو سے مشرقی اقوام بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال عورت کے مغربی طرزِ آزادی کو بھی مغربی استعمار کا شاخسانہ تصور کرتے ہیں۔ چونکہ مغرب میں اخلاقی انحطاط کی بدولت امومت سے انکار کا تصور موجود ہے اس لیے اقبال نے اپنے کلام کے ذریعے امومت کی اہمیت کے مسئلے کا اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کے نزدیک مغربی تحریکِ آزادئ نسواں میں امومت سے انکار کا پہلو موجود ہے جب کہ اسلام میں امومت عین دین و ایمان ہے۔

اس تحقیقی مقالے کا مقصد اقبال کے نظامِ فکر کی روشنی میں امومت کی اہمیت اور اس کا مقصد، عورت کی دینی اور دنیاوی لحاظ سے تعلیم و تربیت اور دنیاوی ترقی میں اس کے نفسیاتی اور نسوانی تقاضوں کو ملحوظ رکھنا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب میں تحریکِ نسواں تانیثی تحریک کے تحت پیدا ہونے والے ازدواجی زندگی کے عدم استحکام، امومت سے گریز، نسوانی و فطری تقاضوں کو نظرانداز کر کے مطلق صنفی مساوات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تہذیب و معاشرت کی بنیادی اکائی خاندان ہے۔ اقبال کے نزدیک خاندانی وحدت بنی نوع انسان کی روحانی زندگی کا سب سے اہم اور بڑا جزو ہے۔ اگر یہ وحدت منتشر ہو جائے تو پورا معاشرہ منتشر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خاندان ایک ایسا ادارہ ہے جو انسان کے رویے اور طرزِ عمل کی تعمیر و تشکیل کرتا ہے چونکہ خاندانی ادارے ہی میں افراد کے تہذیبی طور طریقوں کی پرورش ہوتی ہے۔ اس لیے اقبال کے نزدیک اسلام میں خاندانی نظام کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال عائلی نظام کے استحکام پر زور دیتے ہیں اور اس امر کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ خاندان کے عناصر ترکیبی (شوہر، بیوی، بچہ، ماں، بہن، بھائی) اپنے اپنے فرائض منصبی کو پہچانیں اور خاندانی استحکام کے ذریعے تہذیبی استحکام کا ذریعہ بنیں۔ چونکہ خاندانی نظام میں بنیادی حیثیت ماں کی ہے۔ خاندانی نظام کا استحکام اور تہذیب و تمدن میں اس کا کردار اور خود نسل انسانی اور تہذیبی بقا کا انحصار سب سے زیادہ مامتا کے جذبے پر ہے۔ ماں کی حیثیت سے عورت جو دکھ اور ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھاتی ہے، زندگی کی تعمیر

و تشکیل اسی بنیاد پر ہے۔ چنانچہ اقبال کی نظر میں سب سے اہم اور بنیادی حیثیت ماں کی ہے۔ اسی لیے اقبال نے عورت کو اور خاندانی نظام کو کبھی بھی ماں یا امومت کے تصور سے الگ کر کے نہیں دیکھا۔

اگر اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ تہذیبی و تمدنی زندگی میں عورت کے خاص مقام و مرتبے کو تسلیم کرتا ہے۔ رب کائنات نے قرآن مجید میں مرد و عورت کو ایک دوسرے کا لباس کہہ کر ان دونوں صنفوں کو معاشرتی و تہذیبی اغراض میں ایک دوسرے پر منحصر اور مددگار ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ اقبال عورت اور مرد کی صلاحیتوں کو ایک دوسرے کا باہمی تعاون اور سمجھداری قرار دیتے ہیں۔ تہذیب و تمدن کی تکمیل کے لیے مرد و عورت دونوں کا وجود ضروری ہے، تہذیبی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ دونوں اپنے اپنے فرائض و مقاصد اپنی اپنی صلاحیتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے سرانجام دیں اور ایک دوسرے کے معاون بنیں۔

اقبال کے نظامِ فکر میں تعلیمِ نسواں اور آزادئ نسواں کا تصور:

تعلیمِ نسواں کا عورت کے منصب و مقام اور ان فرائض سے گہرا تعلق ہے جو اسے معاشرے میں انجام دینے پڑتے ہیں۔ چونکہ خاندان معاشرے کی بنیادی اکائی ہے اور ایک عورت ہی خاندان کی تربیت اور نشوونما کو پروان چڑھاتی ہے۔ وہ روایت کی پاسدار، قوم کی حقیقی معمار اور حقیقت میں تمام تمدن کی جڑ ہے۔ قوم کی ترقی و خوشحالی اور خاندان کی بہترین پرورش اور تربیت کے لیے عورت کا تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونا نہایت اہم ہے۔ اس حوالے سے اقبال اپنے مقالات میں رقم طراز ہیں:

> ہمارے لیے ضروری یہ ہے تمدن کی جڑ (عورت) کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں اور اپنی قوم کی عورتوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں۔ مرد کی تعلیم صرف ایک فرد واحد کی تعلیم ہے، مگر عورت کو تعلیم دینا حقیقت میں تمام خاندان کو تعلیم دینا ہے۔ دنیا میں کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی، اگر اس قوم کا آدھا حصہ جاہل مطلق رہ جائے۔[۱۴]

یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علامہ اقبال تعلیمِ نسواں کے پُرزور حامی تھے۔ ان کے نزدیک قوم کی فلاح اور بقا، خاندان کی بہترین تربیت اور امومت کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دینا عورت کے اوّلین فرائض میں شامل ہے۔ لہٰذا اس کے لیے ایک عورت کا مذہبی اور دنیاوی اعتبار سے تعلیم یافتہ ہونا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ ایک مرد کی تعلیم سے صرف ایک فرد ہی فیض یاب ہو سکتا ہے جبکہ ایک عورت کی تعلیم سے پورا خاندان مستفید ہوتا ہے۔ معاشرے کی بنیاد خاندان کی مرکزی حیثیت ماں کو حاصل ہے اور خاندان میں بچوں کی ابتدائی تعلیم کی تمام تر ذمہ داری

ایک ماں کی ہوتی ہے۔ ایسی صورت حال میں اس ذمہ داری کو کماحقہ انجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ عورتوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جائے۔

عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ اقبال عورتوں کی تعلیم اور حقوق کے بارے میں تنگ نظر تھے۔ اس خام خیال کی تردید اقبال کی وہ تقریر کرتی ہے جو انہوں نے مسلم خواتین کے سپاس نامے کے جواب میں کی تھی۔ اس تقریر سے پہلے بھی انہوں نے حقوق نسواں، پردے کا مسئلہ، تعدد ازدواج اور عورتوں کی تعلیم پر خاص طور پر زور دیا تھا۔

ایک عورت کا تعلیم یافتہ ہونے اور اقبال کا تعلیمِ نسواں کے حق میں ہونے کا اندازہ عطیہ فیضی کے نام خطوط سے بھی لگایا جاسکتا ہے، جہاں اقبال اپنے ذہنی انقلابات پر تبادلۂ خیالات کرتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان خطوط میں عورت کا تصور ایک پختہ اور روشن دماغ فرد کے طور پر قائم ہوا ہے اور ان مکاتیب سے اقبال کے نزدیک ایک تعلیم یافتہ عورت کے مقام کی وضاحت ہوتی ہے جو گھر داری اور فرائضِ امومت و تربیت انجام دینے کے ساتھ ذہنی طور پر اتنی پختگی رکھتی ہے کہ مختلف مسائل و موضوعات پر ادراک و تفہیم کر سکے۔ عطیہ فیضی کے نام مکاتیب سے اقبال کا عورت کے حوالے سے قائم کردہ تصور عورت بخوبی واضح ہوتا ہے۔ اقبال ان خطوط کے ذریعے عطیہ فیضی، جو کہ ایک پڑھی لکھی اور روشن دماغ خاتون ہیں، ان سے اپنی ذاتی و قلبی ہیجانات پر نفسیاتی رہنمائی لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان سے ذاتی مسائل پر گفت گو کرتے ہیں اور اپنی نثری و شعری تحریری منصوبوں سے آگاہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اقبال کی زندگی میں آنے والے ایک بحرانی دور میں عطیہ فیضی سے ان کی مراسلت نے ایک مثبت انجام کی صورت اختیار کی۔ مثال کے طور پر ایک خط سے اقتباس درج ذیل ہے:

> ۔۔۔ایک انسان ہونے کے ناطے میرا بھی خوشی پر حق ہے۔ اگر سوسائٹی یا نیچر مجھے اس سے محروم کرتے ہیں تو میں ان دونوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہوں۔ واحد علاج یہی ہے کہ میں اس بدبخت ملک کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دوں یا شراب میں پناہ ڈھونڈوں جو خودکشی کو آسان تر بنا دیتی ہے۔ یہ کتابوں کے مردہ بنجر ورق خوشی نہیں دے سکتے۔۔۔[۱۵]

چنانچہ عطیہ فیضی اس قبیل کے خطوط کے جواب میں اقبال کی ذہنی خلشوں کو دور کرنے کی کوشش کرتی دکھائی دیتی ہیں اور ایسے مقام پر ان کی بھرپور ذہانت و فطانت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک ماہرِ نفسیات کی طرح اقبال کی ذہنی رفاقت کا فریضہ انجام دیتی نظر آتی ہیں۔ ایک جگہ عطیہ فیضی خود اس جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ۔۔۔اقبال کا ۹ اپریل ۱۹۰۹ء کا خط ایسا تھا جو ہمدردانہ سلوک اور احتیاط آمیز برتاؤ کا متقضی تھا۔ میں نے اسے اس کی بدنصیبی پر اظہارِ اضطراب کا خط لکھا۔ مزید میں نے اسے قنوطیت کے آگے سپر انداز ہونے پر جو اس کے خط سے مترشح تھی، تھڑدلے پن کا مجرم ٹھہرایا۔ میں نے یہ ذکر بھی کیا تھا کہ اگر میں ذاتی طور پر اسے مل سکتی تو ان چھوٹی چھوٹی مصیبتوں پر، جو انسانیت کا مشترکہ ورثہ ہیں، قابو نہ پا سکنے پر اسکی

حماقت کی نشاندہی کرتی اور بتاتی کہ صرف وہ لوگ ہی ایسا طریق کار جس کا اس نے اظہار کیا ہے، اختیار کرتے ہیں جو کم خود کفیل ہوں۔۔۔[۱۶]

اسی ضمن میں حیاتِ اقبال میں ایسے واقعات دکھائی دیتے ہیں کہ اقبال ذہین اور تعلیم یافتہ خواتین کے مقام و مرتبے کو سراہتے ہیں، ان سے مختلف معاملات اور موضوعات پر گفت و شنید کرتے ہیں یا پر ان کی معیت میں مختلف مقامات کی قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

تعلیمِ نسواں کی اہمیت کلامِ اقبال میں واضح دکھائی دیتی ہے۔ وہ عورت کو جاہل رکھنے کے مخالف ہیں اور اس کو تعلیم دلانا ضروری سمجھتے ہیں بلکہ عورت کی تعلیم کو مرد کی تعلیم پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔ اقبال تعلیم نسواں کے تو حق میں تھے لیکن اصول سوال یہ ہے کہ طرزِ تعلیم کیا ہو؟ جدید مغربی تعلیم، جو انگریزی حکومت کی سرپرستی میں قائم شدہ مدارس، کالجوں اور یونیورسٹی میں دی جارہی تھی یا مشرقی طرز کی تعلیم جو اس زمانے میں مسلمانوں کے اپنے گھروں کے اندر رائج تھی؟ اس معاملے میں اقبال، سرسید کے ہم خیال تھے، جنہوں نے جدید تعلیم کے ساتھ مذہب کا جزو بھی شامل کر دیا تھا۔ اقبال مسلمان لڑکیوں کو جدید مغربی تعلیم دلانا نہیں چاہتے تھے بلکہ وہ قدیم مشرقی طرز کی تعلیم ہی کو ان کے لیے مفید سمجھتے تھے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری اور اہم ہے کہ اقبال انگریزی زبان کے مخالف نہیں تھے بلکہ وہ انگریزی تعلیم یعنی جدید مغربی تعلیم کو خواتین کے لیے مفید نہ سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں جو لڑکیاں انگریزی تعلیم حاصل کر رہی ہیں، ان کے پیشِ نظر مشرقی طرزِ زندگی کو چھوڑ کر مغربی انداز کو اپنایا ہے اور اقبال کو ہر گز یہ بات گوارا نہ تھی کہ مشرقی تہذیب و تمدن کو فراموش کر کے مغربی ثقافت کو اپنایا جائے۔

اقبال کے جدید مغربی تعلیم کے مخالف خیالات ۱۹۰۴ء سے قبل کے تھے کیونکہ ۱۹۰۴ء اقبال کا مضمون قومی زندگی کے عنوان سے رسالہ مخزن میں شائع ہوا تھا، اس میں انہوں نے خود یہ سوال اٹھایا کہ مسلمان عورتوں بالخصوص مشرقی خواتین کے لیے طریقۂ تعلیم جدید مغربی انداز کا ہونا چاہیے یا پھر کوئی دوسرا طرزِ تعلیم؟ اس ضمن میں (یعنی تعلیم کے ضمن میں) ایک غور طلب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا مشرقی عورتوں کو مغربی طریق کے مطابق تعلیم دی جائے یا کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے ان کے وہ شریفانہ اطوار، جو مشرقی دل و دماغ کے ساتھ خاص ہیں، قائم رہیں۔ میں نے اس سوال پر غور و فکر کیا ہے مگر چونکہ اب تک ملک کسی قابل عمل نتیجے پر نہیں پہنچا، اس واسطے فی الحال میں اس بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

جہاں تک اقبال کا جدید مغربی تعلیم سے مخالفت کا سوال پیدا ہوتا ہے تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ یہ تعلیم مذہب سے بے گانہ یعنی سیکولر ہے اور اقبال عورتوں کی سیکولر تعلیم کے بطور خاص مخالف ہیں۔ کیونکہ عورت کے متعلق اقبال کی فکر کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ وہی قوم و معاشرے کی بنیاد رکھتی ہے اور اس کے تسلسل و بقا کی ذمہ دار ہے۔

عورت کی حیثیت ایوان قوم کی تعمیر میں ایک بنیادی پتھر کی ہے۔اب اگر عورت کو سیکولر تعلیم دی گئی اور دین و مذہب سے اسے بے گانہ رکھا گیا تو پھر:

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تاثر یا می رود دیوار کج

اس کے مصداق پوری قوم کی تعمیر غلط بنیادوں پر ہو گی اور چونکہ ایک عورت کی تعلیم پورے خاندان کی تعلیم ہے اور ایک پوری نسل کی تعلیم ہے۔اس لحاظ سے عورت کو سیکولر تعلیم دینے کے معنی یہ ہیں کہ ایک پورے خاندان کو بلکہ ایک پوری نسل کو دین و مذہب سے بے گانہ کرنا ہے۔

افکارِ اقبال کی روشنی میں عورت کی سیکولر تعلیم سے مراد یہ ہے کہ ایک ایسے ادارے کو دین سے بے گانہ و بے بہرہ کر دیا جائے جو افراد، خاندان، معاشرہ اور قوم کی تعمیر بھی کر سکتا ہے اور تخریب بھی۔ لیکن جب یہ ادارہ خود فکری لحاظ سے دین سے بے گانہ ہو جائے گا تو اس سے تخریب کا عمل ہی جاری ہو گا کہ وہ ایک فکری قوم کی، جس کی بنیاد و اساس ہی دین ہے، تعمیر نہیں کر سکے گا۔

اقبال رقم طراز ہیں:

> ایک قوم کی حیثیت سے ہمارے استحکام کا انحصار مذہبی اصولوں کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہنے پر ہے۔ جس لحہ یہ گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔ شاید ہمارا حشر یہودیوں جیسا ہو جائے تو پھر ہم اس گرفت کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ کسی قوم میں مذہب کا محافظ خاص Principal Depository کون ہوتا ہے؟ عورت اور صرف عورت! اسی لیے مسلمان عورت کو عمدہ، معقول و معتبر دینی تعلیم ملنی چاہیے کیونکہ وہی فی الواقعی قوم کی معمار ہے-----[۷]

ملک و قوم کی فلاح و بہبود عورت سے وابستہ ہے اور ملت کے بقا و استحکام کی ذمہ دار بھی ہے۔ تعلیم دین اور اسرار قرآن سے آگاہی اس کے لیے بغایت لازم ہے کہ اسی کی گود سے حامیان ملت پرورش پا کر دنیا میں نمودار ہوں گے۔ لہٰذا عورت میں ہمت، ولولہ، شجاعت، صداقت اور جوشِ عمل وغیرہ جیسے محاسن ہونے چاہئیں تاکہ فرزندان قوم بھی مکارم اخلاق سے آراستہ ہوں۔

مغربی تہذیب کے تناظر میں آزادیٔ نسواں کا تصور:

آزادیٔ نسواں کے تصور میں علامہ اقبال کے ہاں وسعتِ نظر پائی جاتی ہے۔ آزادیٔ نسواں کا موجودہ نعرہ دراصل مغربی عورت کی شکست خوردہ آواز کی بازگشت ہے۔اقبال کے نزدیک عورتوں نے جب آزادیٔ نسواں کا نعرہ

لگا کر قوانینِ فطرت کو اپنی مرضی کے مطابق لاگو کرنا چاہا تو تہذیب و ترقی ایک طرف خود ان کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔

فریبِ تہذیبِ نو میں آ کر جنھوں نے اپنا شعار چھوڑا
جہاں کی رہ گزر میں پامال صورتِ نقشِ پا رہے

آزادیٔ نسواں کی تحریک، جسے مغرب نے شروع کر کے پروان چڑھایا، اس کا بنیادی مقصد عورت کی زندگی کے ہر معاملے کو مرد کے دوش بدوش کرنا تھا۔ خواہ وہ سیاست کے معاملات ہوں یا معیشت کا میدان یا پھر معاشرتی مسائل و استحکام، زندگی کے ہر شعبے میں ذمہ داری نبھانے کے لیے تیار ہو جیسے اب تک صرف مرد ادا کر رہے تھے۔ اقبال کو آزادیٔ نسواں کی اس تحریک سے اختلاف تھا۔ ان کے نقطۂ نظر میں ان تمام ترقیوں اور ذمہ داریوں کے ساتھ عورت بہتر سلوک کی مستحق ہے۔ عورت کی فطرت اگر امومت کی ذمہ داریوں سے نکل کر انفرادی عیش و عشرت کی آلودگیوں میں پھنسے گی تو وہ اپنا نسوانی جوہر کھو دے گی اور یہ نسب نسلِ انسانی کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

درحقیقت اقبال عورتوں کی ترقی کے مخالف نہیں ہیں بلکہ وہ صرف اس طریق کار کے مخالف ہیں جو آزادیٔ نسواں کی تحریک نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اختیار کر رکھے ہیں اور جو اندھی تقلید کے زیرِ اثر معاشرتی ناہمواری کا باعث بنتے ہیں۔ اس حوالے سے اقبال اپنی بیاض افکار میں لکھتے ہیں کہ

> مغربی خواتین جنھوں نے امومت کے فرائض انجام نہیں دیے انھوں نے اپنی بے کاری کی وجہ سے ووٹ برائے خواتین کا نعرہ لگایا ہے کیونکہ جب کوئی معاشرہ اپنی عورتوں کو پیدائش و پرورشِ اولاد کا موقع نہیں دیتا تو ان کی مصروفیت کے لیے کچھ اور سامان ہونا چاہیے اور یورپ میں حق انتخابِ نسواں کی تحریک، درپردہ ووٹوں کی بجائے شوہروں کی طلب پر مبنی ہے اور یہ شور و شغب بے روزگاروں کے ہنگامے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔[18]

آزادیٔ نسواں کا مغربی تصور، عورت کی فطرت کے خلاف ہے۔ چونکہ اس آزادی کی ابتدا بیرونِ خانہ سرگرمیوں سے ہوتی ہے، جس سے خاندانی نظام میں خلل پڑتا ہے۔ پھر اقتصادی کشمکش میں عورت مرد کے شانہ بشانہ حصہ لینے لگتی ہے جس سے معاشرے میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس بارے میں اقبال لکھتے ہیں:

> مغربی دنیا میں جہاں نفسا نفسی کا ہنگامہ گرم ہے اور غیر معتدل مسابقت نے ایک خاص قسم کی اقتصادی حالت پیدا کر دی ہے، عورتوں کا آزاد کر دیا جانا، ایک ایسا تجربہ ہے جو میری دانست میں بجائے کامیاب ہونے کے الٹا نقصان رساں ثابت ہو گا اور نظام معاشرت میں اس سے بے حد پیچیدگیاں واقع ہوں گی۔[19]

اور بالآخر اس طرح جب خاندانی نظم و ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں اور اس کے باعث معاشرتی اختلال رونما ہوتا ہے تو پھر جنسی آزادی اور صنفی بے راہ روی کی بے لگام رہیں کھل جاتی ہیں۔ رشتۂ ازدواج کی اہمیت ماند پڑنے لگتی ہے اور اس کے نتیجے میں عورت اولاد کو جنم دینے کی ایک عظیم صفت سے انکار کر دیتی ہے اور محض ذواقہ بنی رہنا چاہتی ہے۔ ایسی معاشرتی بگاڑ کی حامل اور تباہ کن آزادی کی اقبال مخالفت کرتے ہیں۔

جدید مغربی تہذیب کی آزادئ نسواں در حقیقت اقبال کے لفظوں میں مرگِ امومت ہے جو سراسر اسلام کے تصور سے متصادم ہے۔ اسلام امومت کا گہوارہ اور آزادی کا پروانہ ہے۔ اس کی تہذیبی قدریں غیر فطری رسم و رواج کی تمام زنجیروں کو کاٹ ڈالتی ہیں۔ اس آزادی کو متوازن رکھنے کے لیے تہذیب و تمدن کی فلاح کے لیے کچھ حد بندیاں قائم کی گئی ہیں تاکہ انسان اپنی خواہشات کے تحت حیوانی سطح پر نہ پہنچ جائے جو جنسی بے راہ روی، معاشرے کی اخلاقی اقدار کے توڑ پھوڑ کا باعث ہو۔ جس کے مظاہرے آج یورپ کی جنسی زندگی میں عام ہیں۔

اقبال نے اپنے مضمون شریعتِ اسلام میں مرد اور عورت کا رتبہ میں Emancipation یعنی مردوں کے غلبے سے آزادی یا تحریکِ آزادئ نسواں کا تذکرہ کیا ہے۔ تحریکِ آزادی کی یہ اصطلاح اقبال ہی کے زمانے میں فعال ہو چکی تھی۔ اقبال کے نزدیک Emancipation کی یہ تحریک عائلی نظام کے لیے خطرہ کن تھی جسے اسلامی معاشرے میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر ابن فرید اقبال کا عمر انیاتی مطالعہ میں لکھتے ہیں کہ:

> اس تحریک کے ذریعے اس زمانے ہی سے، عورت کو مرد کے مقابل جارحانہ بغاوت کے جذبے کے ساتھ کھڑا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ عورت خاندانی زندگی کو فطری تقاضوں کی بجائے معاشری استحصال تصور کرنے لگے۔ اس طرح خاندان کے دو اہم ستونوں میں رفاقت و مساوات کے بجائے افتراق و عناد پیدا ہو رہا ہے اور خاندان کی بنیادی اکائی تحلیل ہوتی جارہی ہے۔[۲۰]

اقبال کے خیال میں مغربی آزادئ نسواں کی تحریک سے بہت پہلے اسلام نے عورت کو سماجی، تہذیبی، معاشی و انفرادی اور انسانی حیثیت کے طور پر تسلیم کر لیا تھا اور اسے اس قدر عزت و عظمت سے نوازا کہ وہ تمدنی بنیاد قرار پائی۔ اسلام خود تحریکِ آزادئ نسواں کا علم بردار ہے وہ عورت کی آزادی، مساوات اور عظمت و انفرادیت کا بھی قائل ہے لیکن مغربی تہذیب کے برعکس اسلام اعتدال و توازن کو ملحوظ رکھتا ہے چنانچہ اسلام کے یہی تصورات اقبال کے ہاں بھی موجود ہیں۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان رقم طراز ہیں:

حقیقت میں اقبال کا نقطۂ نظر اس باب میں یہ نہیں کہ وہ عورتوں کی ترقی کے خلاف ہیں۔ ہاں وہ ان طریقوں کے خلاف ہیں جو آزادئ نسواں کی تحریک نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اختیار کیے ہیں۔[۲۱]

اقبال مغربی تصور آزادی نسواں کو مادر پدر آزادی اور بے جا آزادی قرار دیتے ہیں اور ایسی آزادی کو خلاف فطرت نسوانی تصور کرتے ہیں۔ وہ خواتین کو بذاتِ خود تحریک نسواں شروع کرنے پر اکساتے ہیں۔ اقبال کو اس بات کا احساس تھا کہ مغربی تہذیب کی بدولت بدلتے ہوئے معاشرتی حالات کے باعث مسلمان عورت نے اسلام کے بنیادی اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اگر خود کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نہ کیا تو مسلمان جدید مغربی تہذیب اور آزادئ نسواں کے منفی اثرات کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ ان منفی اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے مسلمان خواتین کو اپنی ذات کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنا ہوگا اور آزادی کے درست مفہوم کو سمجھنا ہوگا۔

اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی میں کچھ اصلاحات نافذ کی تھیں جن سے ترک خواتین کو یورپی عورتوں کی طرح بے جا آزادی مل گئی تھی۔ اس آزادی پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں:

مصطفیٰ کمال پاشا نے، جو کچھ اصلاحات کے سلسلہ میں کیا ہے وہ ہر گز حکمت پر مبنی نہیں۔ عورت کو آزادی خود شریعت اسلامی نے دے رکھی ہے۔ مصطفیٰ کمال کیا دیں گے؟ ہاں! مادر پدر آزادی کی شریعت نے کبھی اجازت نہیں دی اور نہ کوئی ہوش مند انسان کبھی اس کی خواہش کرے گا۔ بے جا آزادی سے ترکی میں یورپین قسم کا ناچ شروع ہوا، اسی مصطفیٰ کمال کو وہ ناچ حکماً بند کرنا پڑا۔

غرض یہ کہ آپ کو لفظ آزادی پر نہیں جانا چاہیے، آزادی کے صحیح مفہوم پر غور کرنا چاہیے۔ یورپ کی آزادی کو ہم خوب دیکھ چکے ہیں۔ ہم کو کوشش کرنی چاہیے کہ ہم رواج کی قیود سے آزادی حاصل کریں۔۔۔۔ اور اسلام کی اعلیٰ تعلیم سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔[۲۲]

آزادئ نسواں کو اقبال یورپ کی طرح مادر پدر آزادی نہیں بنانا چاہتے۔ ان کی رائے میں عورت کے لیے اخلاقی پابندیوں کا برقرار رہنا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ اصلاح تمدن اور تعلیم عام کی ضرورت پر انھوں نے ہمیشہ زور دیا۔ جہاں تک عورت کی آزادی و مساوات کا تعلق ہے خود اسلام حقوق نسواں کی ایک پرزور تحریک ہے۔ اموومت سے انکار، مادر پدر آزادی، اخلاقی و جنسی بے راہ روی، خاندانی نظام سے گریز، عورت اور مرد کی مساوات کی غلط اور غیر فطری تعبیر، نسوانی فطری تقاضوں کو نظر انداز کرنا اور بنیادی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرنا، اقبال کے نزدیک آزادی حاصل کرنے کا یہ غیر فطری عمل ہے جو تہذیب و تمدن میں انتشار کا باعث تو بن سکتا ہے، وحدت اور ارتقا پیدا نہیں کر سکتا۔ نسوانی فطرت میں خدا نے بلند جذبات رکھے ہیں۔ ان کی حفاظت اسلامی طرزِ زندگی سے ہو سکتی ہے۔ جس قوم میں عورتوں کی زندگی احترام سے محروم ہو وہاں پر مردوں کو بھی حیات صالح نصیب نہیں ہو سکتی۔ کسی بھی قوم کی

تہذیب کو جانچنے کے لیے اس قوم میں عورتوں کے مقام اور مرتبے کو دیکھا جاتا ہے۔ اقبال نے مرد اور عورت کو اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی کا پیغام دیا ہے۔ عورت میں جب یہ احساس ذمہ داری بیدار ہو گا تو وہ اصلی مقام تک رسائی حاصل کر سکے گی۔ کیونکہ اقبال کا بنیادی مقصد ہی فرد اور معاشرے کی اصلاح و فلاح اور انھوں نے خصوصاً اس موضوع پر تمام تر دینی و سماجی اور مشرقی تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے عورت کے مقام و مرتبے کی توضیح کی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد رفیق افضل (مرتبہ)، گفتارِ اقبال (لاہور: ادارۂ تحقیقاتِ پاکستان، دانش گاہ پنجاب، طبع اوّل، ۱۹۶۹ء)، ص ۷۵۔

۲۔ علامہ محمد اقبال، "قومی زندگی" مشمولہ مقالاتِ اقبال (لاہور: آئینہ ادب، چوک مینار، ۱۹۹۷ء) ص ۵۵۔

۳۔ علامہ محمد اقبال، مقالاتِ اقبال (قومی زندگی)، مرتبہ: عبدالواحد معینی سید، ص ۹۲۔۹۳۔

۴۔ علامہ محمد اقبال۔ مقالاتِ اقبال (شریعت اسلام میں مرد اور عورت کا رتبہ)، مرتبہ: عبدالواحد معینی سید، ص ۳۱۹۔۳۲۰۔

۵۔ جگن ناتھ آزاد، کلامِ اقبال میں عورت کا درجہ" مشمولہ اقبال اور عورت، مرتبہ: خادم علی جاوید ص ۱۱۵۔

۶۔ خلیفہ عبدالحکیم، "رموزِ بے خودی" مشمولہ فکرِ اقبال، ص ۴۹۵۔

۷۔ علامہ محمد اقبال، مقالاتِ اقبال، مرتبین: عبدالواحد معینی سید، محمد عبداللہ قریشی (لاہور: آئینہ ادب، طبع دوم، ۱۹۸۸ء)، ص ۹۳۔

۸۔ بصیرہ عنبرین۔ اقبال، وجودِ زن اور عقدۂ مشکل کی کشود، ص ۳۷۔

۹۔ طالب حسین سیال۔ اقبال اور انسان دوستی (کراچی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء)، ص ۲۴۴۔۲۴۷۔

۱۰۔ علامہ محمد اقبال، مقالاتِ اقبال، مرتبین: عبدالواحد معینی سید، محمد عبداللہ قریشی، (لاہور: آئینہ ادب، چوک مینار، ۱۹۹۷ء) ص ۵۶۔۵۷۔

۱۱۔ بصیرہ عنبرین، اقبال: وجودِ زن اور عقدۂ مشکل کی کشود۔ ص ۳۲۔

۱۲۔ علامہ محمد اقبال، مقالاتِ اقبال، مرتبین: عبدالواحد معینی سید، محمد عبداللہ قریشی، (لاہور: آئینہ ادب، چوک مینار، ۱۹۹۷ء) ص ۵۷۔

۱۳۔ صائب تبریزی کا شعر۔ فارسی غزل گو شاعر۔

۱۴۔ *Stray Reflections* مرتبہ جاوید اقبال (لاہور: مطبوعہ، جون ۱۹۶۱ء)، ص ۳۰۔

۱۵۔ علامہ محمد اقبال، شذراتِ فکرِ اقبال، مرتب و مترجم: افتخار احمد صدیقی، جاوید اقبال (لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع دوم، ۱۹۸۳ء)، ص ۱۱۴۔

۱۶۔ علامہ محمد اقبال، "ضربِ کلیم" مشمولہ کلیاتِ اقبال (اردو) (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۲۰۱۲ء)، ص ۴۵۸۔

۱۷۔ ابن فرید، "اقبال کا عمرانیاتی مطالعہ (مضمون)" مشمولہ اقبالیات کے سو سال، مرتبہ: رفیع الدین ہاشمی، محمد سہیل عمر، وحید عشرت، ص ۶۳۷

۱۸۔ یوسف حسین، روحِ اقبال (نئی دہلی: غالب اکیڈمی، نظام الدین روڈ، ۱۹۴۲ء)، ص ۲۴۴۔

۱۹۔ محمد رفیق افضل (مرتبہ)، گفتارِ اقبال (لاہور: ادارۂ تحقیقاتِ پاکستان، دانش گاہ پنجاب، ۱۹۶۹ء)، ص ۸۲۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۸۳۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۸۹۔

۲۲۔ علامہ محمد اقبال، مقالاتِ اقبال (شریعت اسلام میں مرد اور عورت کا رتبہ) مرتبہ: سید عبدالواحد معینی (لاہور: آئینہ ادب، چوک مینار، ۱۹۹۷ء)، ص ۳۲۷۔۳۲۸۔

باب چہارم:

تانیثیت کی تحریک کے تناظر میں اقبال کے تصورِ عورت کا تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ

باب چہارم:

تانیثیت کی تحریک کے تناظر میں اقبال کے تصور عورت کا تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ

تانیثی تحریک، مردوں کے ساتھ خواتین کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی مساوات کے لیے ایک تحریک ہے۔ زمانہ ماضی میں دنیا کے بیشتر حصوں میں عورتوں کے ساتھ عدم مساوات اور استحصال کا برتاؤ کیا جارہا تھا۔ ایسے حالات میں مغربی ممالک میں تانیثی تحریک کے تحت عورت کے حق میں آواز بلند کی گئی۔ اس سلسلے میں پوری دنیا میں آزادئ نسواں کی تحریکیں زور پکڑنے لگیں۔ حقوق نسواں کی اصطلاح میں صنفی فرق کے معاملات سے وابستہ سیاسی اور سماجی نظریات شامل ہیں جن کا مقصد جسمانی سالمیت، خود مختاری، تولیدی حقوق، عصمت دری، جنسی ہراسانی اور گھریلو تشدد سے خواتین کو قانونی تحفظ کے مساوی حقوق کا قیام ہے۔ اس تناظر میں علامہ اقبال نے اپنی شاعری، مقالات، خطبات اور مباحثوں کے ذریعے معاشرے میں خواتین کے کردار اور مقام و مرتبہ کے بارے میں اپنے تصورات پیش کیے۔ انھوں نے اسلامی نقطۂ نظر سے ایک مضبوط اور قابل عزت عورت کا تصور پیش کیا اور اپنے نقطۂ نظر کو دین اسلام کے عین مطابق تشکیل دیا۔

علامہ اقبال بحیثیت مفکرانہ اور مصلحانہ انداز سے اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ بنی نوع انسان کی تاریخ میں انسانی معاشرے کی تعمیر و تشکیل اور اس کے ارتقا میں خواتین نے ہمیشہ مثبت کردار ادا کیا ہے۔ اقبال تانیثی تحریک کے اغراض و مقاصد سے متفق بھی ہیں اور متفکر بھی۔ متفق اس نکتے سے کہ عورت کو عدم مساوات اور حقوق کے استحصال کے خلاف آواز بلند کرنی چاہیے جب کہ متفکر اس اعتبار سے کہ مسلمان عورت جدید تانیثیت کو اپناتے ہوئے اپنی مشرقی اور خاص طور پر اسلامی تہذیبی روایات اور ان کے فیوض و برکات سے تہی دست نہ ہوتی چلی جائے۔ اس ضمن میں اگر دیکھا جائے تو عورت کے متعلق اقبال کے تصورات و نظریات بھی وہی ہیں جو قرآن و حدیث کے ہیں۔ البتہ اس پر فلسفیانہ رنگ غالب ہے۔ وہ عورت کو اس دائرے میں دیکھنا چاہتے ہیں جس کی تعلیم اسلام نے دی ہے اور اسی بنا پر وہ آزادئ نسواں اور مرد و زن کی مساوات مطلق کو جو مغربی تہذیب کی دین ہے، پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

اقبال اپنی شاعری کے ذریعے مغربی تہذیب کے ہر اس پہلو کی مخالفت کرتے ہوئے ان خامیوں کو اجاگر کرتے ہیں جس کے سبب معاشرے میں برائیاں جنم لیتی ہیں اور مادیت کا غلبہ اور روحانیت کا فقدان ہوتا ہے۔ اس حوالے سے بھی انہوں نے مغربی تہذیب کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت
ہے حضرت انسان کے لیے اس کا ثمر موت[1]

اگر علامہ اقبال کے تصور زن اور مغربی تصور زن کا تقابل کیا جائے تو مشرق اور مغرب کی معاشرت پیشِ نظر آتی ہے۔ مشرقی عورت حیادار، باسلیقہ اور تہذیب یافتہ اور دینِ اسلام کی تعلیمات کے دائرہ کار کے مطابق ہے جب کہ مغرب میں عورت ہر طرح کی حدود و قیود سے آزاد ہے۔ مشرقی و مغربی معاشرت میں جو بڑا تفاوت پایا جاتا ہے۔ اس کا تذکرہ اقبال اپنے کلام کے ذریعے کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عورت کے مسئلے میں بھی مسلمانوں کو مغرب کی تقلید نہیں کرنی چاہیے بلکہ اس کے برعکس قرآن و سنت کو مشعل راہ بنانا چاہیے اور اپنے معاشرے میں عورت کو بحیثیت بیٹی، بیوی اور ماں کے وہی مقام دینا چاہیے جو خدا اور اس کے رسول ﷺ نے دیا ہے۔

اقبال آزادئ نسواں کے متعلق بھی اپنا ایک الگ، منفرد اور پختہ نظریہ پیش کرتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک آزادی سے مراد یہ ہے کہ عورت کو سماج میں ہر طرح کی آزادی ملنی چاہیے مگر وہ آزادی ایسی نہ ہو کہ جس سے اپنی تہذیب اور اخلاق میں گراوٹ آئے یعنی مغربی تہذیب کے زیرِ اثر عورت معاشرے میں جو مقام تلاش کر رہی ہے۔ وہ مشرقی تہذیب کے منافی ہے۔ لہٰذا اقبال آزادئ نسواں کے پُرزور حامی تھے ہی مگر اس آزادی کے خلاف بھی تھے جو مغربیت کے طرز پر ہو اور ایسی آزادی اقبال کی نظر میں زہر قند کے مترادف ہے۔

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے، وہ قند[2]

عورت سے متعلق اقبال کے تصورات و نظریات بھی ان کی شاعری کے دیگر اہم موضوعات کی طرح کتاب و سنت کی تعلیمات سے حد درجہ مماثل ہیں۔

قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے:

ترجمہ: "وہ (عورت) تمہارے لیے لباس ہے اور تم اس کے لیے لباس ہو۔"[3]

قرآن مجید کی یہ آیت سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مصداق ہے۔ اس کا تجزیہ کرنے سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ عورت کی عفت و پاکبازی اور مرد کی پاکیزگی و پاک دامنی ایک دوسرے پر منحصر ہے اور اسی وجہ سے مرد و زن معاشرتی و تمدنی زندگی کے اغراض و مقاصد کے لیے ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔

قرآن مجید میں ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"مرد عورت پر قوام ہے۔"[4]

یہ آیت بھی انتہائی فکر انگیز ہے۔ اقبال قرآن کریم کی اس آیت سے اکتساب فیض حاصل کرتے ہوئے تصور زن پیش کرتے ہیں کہ مرد عورت کا محافظ ہے۔ وہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل چاہتے ہیں جس میں عورت کو مرد کے دوش بدوش کھڑا کر سکیں۔ جس کا وہ اپنے کلام میں جابجا ذکر بھی کرتے ہیں۔ عورت کی عزت، مقام و مرتبہ اور حقوق کی حفاظت کو اقبال مرد کا اولین فریضہ سمجھتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک عورت اور مرد دونوں کے باہمی تعاون سے ہی کائنات عشق کی تخلیق ممکن ہے۔ عورت زندگی کی آگ کی خازن ہے۔ وہ انسانیت کی آگ میں خود کو جھونکتی ہے اور اس آگ کی تپش سے انسان کی ارتقا ہوتی ہے۔

وجود نسواں سے متعلق دینِ اسلام مثبت اور منصفانہ فکر و نظر پیش کرتا ہے۔ اسلام نے عورت کا ملکیت اور وراثت میں حق، اپنی پسند کے مطابق نکاح اور خلع، حصولِ علم اور دیگر تمام حقوق کو محفوظ کرنے کے لیے باضابطہ "شرعی قوانین" نافذ کیے ہیں۔

حجۃ الوداع کے موقع پر بھی رسول اللہ ﷺ نے تمام لوگوں سے یہی ارشاد فرمایا کہ:

"عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔ تمہارا عورتوں پر حق ہے اور عورتوں کا تم پر۔"

اللہ کے رسول ﷺ کے اس فرمان کا مقصد عورتوں کے مقام و مرتبہ اور حقوق و فرائض کو اجاگر کرنا ہے اور وہی امومت کے فرض کو بھی واضح کرتا ہے۔ عورت کی عظمت و شرف کو مد نظر رکھتے ہوئے اقبال نے امومت کو رحمت سے تعبیر کیا ہے اور اسے نبوت سے تشبیہ دی ہے۔ ان کے نزدیک اقوام سیرت سازی اور خودی کے استحکام میں شفقت مادر اور شفقت نبوت دونوں اہمیت کے حامل ہیں۔

اقبال عورت کے پردے سے متعلق اپنے فلسفیانہ انداز میں اس حقیقت کی عقدہ کشائی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس طرح خدائے لم یزل پس پردہ نظام کائنات کو چلا رہا ہے اسی طرح عورت بھی پردے میں رہ کر جملہ جائز کاموں میں حصہ لے سکتی ہے اور اپنے فرائض کو بخوبی انجام دے سکتی ہے۔ پردہ اس میں رکاوٹ نہیں ہو سکتا۔

"خلوت" کے عنوان سے اپنی ایک نظم میں اقبال کہتے ہیں کہ اپنی ذات کے امکانات سے شعور و آگہی کی خاطر عورت کے لیے خلوت ناگزیر ہے۔ جس طرح صدف کی آغوش میں قطرۂ نیساں جوہر بنتا ہے اسی طرح خلوت میں ہی نسوانی جوہر کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے اور اسی میں عورت کی عظمت اور ترقی کا راز مضمر ہے۔

اسی ضمن میں اقبال کے تصور زن کے حوالے سے ناقدین نے بھی اپنی تنقیدی آراء کا اظہار کیا۔

۱۔ اقبال خواتین کو جدید عہد میں ان کا صحیح مقام دینے کے حامی نہیں ہیں۔

۲۔ وہ آزادئ نسواں کی مخالفت کرتے ہوئے عورت کو سخت پردے میں رہنے اور زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

۳۔ وہ عورتوں کی عصری تعلیم کے خلاف ہیں۔

آزادئ نسواں کے مبلغین کے ان اعتراضات پر غور کرتے ہوئے اگر اس تحریک کے پس منظر میں دیکھا جائے کہ یہ تحریک کس معاشرے میں اور کب زیرِ بحث آئی تو جدید طرز فکر کے حامل ان مبلغین کے اعتراضات کے جواب واضح ہو جاتے ہیں۔

مغربی معاشرے میں صنعتی انقلاب تک یعنی سولہویں اور سترھویں صدی تک عورت ایک سامان تفریح سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی۔ مغربی معاشرے میں نہ اس کی کوئی قدر و قیمت تھی اور نہ ہی اہمیت۔ عورت کو ان تمام انسانی مراعات سے بھی محروم رکھا جاتا جن کی وہ حق دار تھی اور جمہوری معاشرے میں بھی اسے انتخابات میں ووٹ دینے کا حق نہ تھا۔ صنعتی انقلاب نے عورت کو مشین کا ایک پرزہ بنا کر رکھ دیا۔ ان منفی حالات کے پیشِ نظر آہستہ آہستہ مغرب میں جب خواتین صنعتی اکائیوں سے جڑنے لگیں تو آزادئ نسواں کی لہر چلی اور مرد و عورت دونوں کو مساویانہ حقوق اور مراعات دینے کا مطالبہ شروع ہوا۔ مغرب میں عورت تمام اخلاقی اور فطری قیود سے آزاد ہو کر اپنی معاشی زندگی کے شب و روز کی کاروائیوں کو طے کرنے لگی۔

اقبال چونکہ اسلامی شعائر، تہذیب اور تعلیمات کے پروردہ تھے اور اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین عورت اور مرد خاندانی اکائی کے دو ایسے پہیے ہیں جن کے بغیر نظامِ زندگی کی گاڑی نہیں چل سکتی۔ دینِ اسلام نے مرد کو عورت کا قوام یعنی نگران اور منتظم بنایا ہے جو عورت کے مقام و مرتبہ کو عزت دیتے ہوئے اس کی عظمت اور حقوق کی حفاظت کرے۔ اس سے ہر گز مراد یہ نہیں ہے کہ مرد افضل ہے اور عورت کا درجہ فضیلت کم ہے۔ بلکہ قرآنِ حکیم نے مرد و عورت کے مساویانہ حقوق کی حمایت چودہ سو سال پہلے ہی کر دی تھی۔ انگریزی فلسفی برنارڈ لیویس[۵] نے اپنی کتاب "*What went wrong*" میں اس بات کا برملا اعتراف کیا ہے کہ

> Islamic civilization granted muslim women relatively more property rights than women in the west.[۶]

عورتوں کو اسلام نہایت عزت و احترام کا مقام دیتا ہے اور وہ تمام حقوق میسر کرتا ہے جو فطری زندگی کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس حوالے سے علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ:

> اگر عورتیں اپنے حقوق کی حفاظت پر پورے طور پر آمادہ ہو جائیں اور وہ حقوق جو شریعت اسلامی نے عورتوں کو دے رکھے ہیں، آپ مردوں سے لے کر رہیں تو میں سچ کہتا ہوں کہ مردوں کی زندگی تلخ ہو جائے۔[۷]

علامہ اقبال عورت کے ان حقوق کے پُرزور حامی ہیں جو دینِ اسلام نے یورپی تانیثی تحریک کی آواز بلند کرنے

سے بہت صدیوں پہلے دیے اور آزادی کے نام پر عورت کی بے راہ روی کی مخالفت کرتے ہیں۔ اقبال قومی تعمیر و تشکیل میں عورت کے زبردست قائل ہیں اور اسے بروئے کار لانا چاہتے ہیں۔ اسی نقطۂ نظر کو انہوں نے اپنے ایک مضمون میں پیش کیا جو ۱۹۳۳ء میں "لور پول پوسٹ" لندن میں شائع ہوا۔ مشرق و مغرب میں خواتین کے مقام و مرتبہ پر لکھتے ہوئے فرمایا کہ :

> میں اس خیال سے لرزہ براندام ہو جاتا ہوں کہ عورتیں قوتِ لایموت کا خود بندوبست کریں۔ اس طرزِ عمل سے نسائیت کا جوہر تباہ و برباد ہو جائے گا۔[۵]

اقبال نے مثنوی اسرار و رموز، جاوید نامہ، ارمغانِ حجاز اور ضربِ کلیم میں متعدد مقامات پر معاشرے میں عورت کا مقام و اہمیت اور اس کے تقدس و احترام پر اظہارِ خیال کیا ہے کہ وہ عورت کے معاملے میں یورپ کے طرزِ عمل پر بہت پریشان ہیں۔ مغربی معاشرے میں غیر معتدل مسابقت نے ایک خاص قسم کی اقتصادی حالت پیدا کر دی ہے۔ عورتوں کا آزاد کر دیا جانا ایک ایسا تجربہ ہے جو ان کی دانست میں کامیاب ہونے کی بجائے نقصان رساں ثابت ہو گا اور نظامِ معاشرت میں اس سے پیچیدگیاں واقع ہوں گی۔

مشرقی و مغربی معاشروں کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے اگر دیکھا جائے تو مشرقی معاشرے میں اسلام عورت کے لیے ایسے ماحول کی حمایت کرتا ہے جہاں عورت اپنی مثبت صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اور فطرت اسلام کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنا فرض منصبی نبھا سکتی ہے کیونکہ ایک عورت کے لیے یہ کیا کم خوش نصیبی ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے مشاہرین وقت اس کی گود میں پلے بڑھے ہیں۔

اقبال ایک راسخ العقیدہ مسلمان اور اسلام کے جدید مفسر ہیں۔ اقبال نے زمانے کو جدید و قدیم میں تقسیم نہیں کیا۔ ان کی نظر مشرق و مغرب کے ماضی، حال اور مستقبل پر تھی۔ اقبال مشرق و مغرب کی شب کو سحر کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال مغرب کی خوبیوں کی تعریف کرتے ہیں اور اس تہذیب میں اخلاقی اور معاشرتی برائیاں نظر آتی ہیں۔ وہ برائیاں اور ان کے نتائج سب کے سامنے عیاں ہیں۔ ان کی تنقیص کرتے ہیں، فکرِ اقبال کا بنیادی سرچشمہ اسلام ہے اور وہ اسلام کی حاکمیت پر مکمل اعتماد رکھتے ہیں۔ وہ ان تجدد پسند لوگوں کی مذمت کرتے ہیں جو احکامِ شریعت کے کاربند نہیں۔ مغربی معاشرہ آزادیٔ نسواں کے حق میں ہے مگر اقبال عورت کو اسلام کی مقرر کردہ حدود میں رہتے ہوئے آزادی دینے کے حق میں ہے اور اشتراکیت پسندوں کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے کہ عورت کے ضمن میں نہ صرف مخالفین و معترضین بلکہ قدردانوں نے بھی اقبال کو قدامت پرست اور ماضی پرست قرار دیا ہے۔

مشرق و مغرب کے تصورِ زن کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے اقبال پر ناقدین کی آراء اور ان کے اعتراضات بے بنیاد ثابت ہو جاتے ہیں کہ اقبال نے عورت کے متعلق تنگ نظری اور تعصب سے کام لیا ہے۔ دراصل ان کے افکار کی بنیاد

اسلامی تعلیمات پر ہے۔ عورت کے متعلق بھی وہ انہی حدود و قیود کے حامی ہیں جو اسلام نے مقرر کی ہیں۔ یہ حدود و قیود عورت کو نہ تو اس قدر پابند بناتی ہے جو پردہ کے مروجہ تصور نے سمجھ لیا ہے اور نہ ہی اس قدر آزادی دیتی ہے جو مغربی معاشرے نے عورت کو دے رکھی ہے۔ نہ یہ پردے کا تصور اسلام کا مقصد ہے اور نہ ہی آزادی اسلام دیتا ہے۔ اسلام عورت کے لیے ایسے ماحول اور مقام کا حامی ہے جس میں وہ اپنی تمام تر صلاحیتیں بہتر طور پر استعمال کر سکے اور یہی نظریات اقبال کے ہیں۔ یہ فطرت بھی عین مطابق ہے کہ اس کی خلاف ورزی معاشرت میں بگاڑ اور انتشار کا باعث بنتی ہے۔

اسلام نے عورت کو ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے ہر حیثیت سے عزت و احترام بخشا اور یہ عزت و احترام اسے طبعی شرم و حیا، اولاد سے بے پناہ محبت اور صنف نازک ہونے کی وجہ سے ملا جب کہ دور حاضر کی تہذیب نے عورت سے یہ خصوصیات چھین لی ہیں۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عورت کا احترام معاشرے سے رخصت ہوتا جا رہا ہے۔ جب عورت ہر میدان میں برابری کے دعوے کرے گی اور اس راہ میں فحاشی کی حدود کو پار کر جائے گی تو مرد کی نگاہوں میں اس کا احترام کس طرح باقی رہ سکتا۔ عورت کے لیے ترقی کی وکالت کرنے والے مسلمان مفکرین اور دانشور اس فکر کو بنیاد بنا کر تحریک آزادی نسواں کی حمایت کر رہے ہیں کہ مسلمان معاشروں میں وہیں اصلاحات اور قوانین نافذ کیے جائیں جو مغربی ملکوں میں رائج ہیں۔ جو انہوں نے خواتین کے مردوں کے دوش بدوش چلنے کے لئے لاگو کیے ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ طبقہ ہے تو مسلمان مگر اپنے معاشرے کی ضرورت سے قطع نظر ان کی نظر یورپ کے ساتھ مسابقت پر ہے۔

مغربی استعماریت میں ہمیشہ اسلامی دنیا میں اپنے قدم مضبوط کرنے کے لیے ایسے منصوبے مرتب کیے ہیں اور اس انداز سے کیے کہ وہ بظاہر بغیر کسی نقصان کے پورے اسلامی معاشرے میں سرایت کر گئے۔ اسی طرح مسلمانوں کو ذہنی طور پر غلام بنانے اور انھیں اپنی روایت سے منحرف کرنے کے لئے مغربی تہذیب نے ایسا نظام تعلیم وضع کیا جو بظاہر ترقی اور خوشحالی کا آئینہ دار تھا۔ چنانچہ جدید تعلیم کو بھی اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا گیا اور تعلیم کے نام پر آگاہی و ادراک کی بجائے تعلیم برائے حصول ترقی کو مقصد بنایا گیا اور اس مقصد کے لیے ہمارے ہی علماء و مفکرین کو استعمال کیا گیا۔ مسلمان عورتوں کو بھی اس رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی جو رنگ ڈھنگ مغربی عورت نے اپنی اور اپنے خاندان، مذہب کے تقاضوں کو یکسر فراموش کر دیا۔ اقبال جیسے عظیم دانشور نے مسلم معاشرے میں اس قسم کے انسان کی شدید مذمت کی اور اسے معاشرے کے لئے انتہائی مہلک قرار دیا۔ اس طرح عورت کی ترقی کو کامیابی اور ترقی کی بجائے تنزلی میں شمار کیا۔ عورت کی ترقی کے جدید فلسفہ نے عورت سے نسوانیت چھین لی۔ اسے نہ صرف اپنی فطری فرائض سے دور کر دیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کی ذات کو بھی یکسر منتشر کر دیا۔

جدید نظریات کے مطابق تصور عورت کی بھرپور ترجمانی "تحریکِ آزادی نسواں" کے منشور سے ہوتی ہے۔اس تحریک کے وجود میں آنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ دراصل ایک طویل مدت سے ہونے والے "استحصال نسواں" کے ردّ عمل میں آئی۔ تحریکِ نسواں کے علم برداروں اور نظریہ سازوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ عورت اور مرد دونوں ہر اعتبار سے برابر ہیں۔ایک صنف کو کسی بھی زاویے سے اور زندگی کے کسی بھی شعبے میں دوسری صنف پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔دونوں اصنافِ جنس کو حیات وکائنات کے تمام تر شعبوں میں برابر حقوق واختیارات حاصل ہیں اور ان کے فرائض بھی یکساں ہیں۔اس کائنات میں کوئی ایسا وظیفہ حیات نہیں ہے جس کی انجام دہی کے لیے صنفی تفریق کو جائز قرار دیا جاسکے۔خواہ وہ تجارت ومعیشت ہو یا صنعت وحرفت۔عدلیہ، مقننہ کے شعبے ہوں یا پھر سیاست و قیادت۔گویا نسوانی آزادی کے علم برداروں نے یہ دعویٰ کیا کہ مرد اور عورت ذمہ داریاں اور حقوق وفرائض یکساں اور مساوی ہونے چاہیے۔

مساوات مرد وزن جلد کا حقیقی مفہوم یہی ہے کہ عورت اور مرد حقوق میں دونوں مساوی ہیں-اسلام میں ایسا بالکل نہیں ہے کہ مردوں کو معاشرے میں تمام حقوق حاصل ہے مگر عورتیں ان حقوق سے محروم ہیں-مساوات کے معنی یہ سمجھ لیے گئے ہیں کہ عورت اور مرد نا صرف اخلاقی مرتبہ اور انسانی حقوق میں مساوی ہوں بلکہ تمدنی زندگی میں بھی عورتوں ہی کام کرے جو مرد کرتے ہیں اور اخلاقی بندشیں اس طرح کمزور کردی جائیں-مساوات کے اس غلط خیل نے عورت کو ان فطری وظائف سے غافل کر دیا جس کی بجاآوری پر تمدن کی بقا بلکہ نوع انسانی کی بقا کا انحصار ہے-معاشی، سیاسی اور اجتماعی سرگرمیوں میں ان کی شخصیت کو پوری طرح اپنے اندر جذب کر لیا-انتخابات کی جدوجہد، دفتروں اور کارخانوں کی ملازمت، آزاد تجارتی صنعتی پیشوں میں مردوں کے ساتھ مقابلہ، کھیلوں اور ورزشوں کی دوڑ دھوپ، سوسائٹی کے تفریحی مشاغل میں شرکت، کلب سٹیج اور رقص وسرور کی مصروفیت عورت پر کچھ اس طرح چھا گئی کہ ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں، بچوں کی تربیت، خاندان کی خدمت، گھر کی تنظیم، ساری چیزیں اس کے لائحہ عمل سے خارج ہو کر رہ گئیں-

تصور عورت سے متعلق جدید مغربی نظریات کے برعکس اگر اسلامی نظریات کا جائزہ لیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں انسان کو بلا تفریق جنس قرار دیا ہے۔مرد اور عورت کے درمیان قوتوں اور صلاحیتوں کے فرق کو عزت اور ذلت کا پیمانہ بنانے کے بجائے انہیں یکساں مقام ومرتبہ عطا کیا ہے۔

"مغربی افکار کے پیشِ نظر اگر مرد اور عورت دونوں ایک ہی جیسے کام کے لیے پیدا ہوئے تھے تو پھر دونوں کی جسمانی طور پر الگ الگ تخلیق کی کیا ضرورت تھی۔مرد کا جسمانی نظام الگ ہے اور عورت کا جسمانی نظام الگ۔مرد کا مزاج اور صلاحیتیں مختلف ہیں اور عورت کی مختلف۔اللہ تعالیٰ نے دونوں صنفیں اس طرح بنائی ہیں کہ دونوں کی تخلیقی

ساخت اور اس کے نظام میں بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ مرد اور عورت میں کسی طرح کا کوئی فرق نہیں ہے، یہ خود فطرت کے خلاف بغاوت ہے اور مشاہدے کا انکار ہے کہ مرد اور عورت کا جسمانی نظام مختلف ہے۔ دونوں مختلف صنفیں ہیں۔ دونوں کے انداز زندگی اور صلاحیتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔"[۹]

مذہب اسلام تمام دنیاوی مذاہب میں سے ایسا واحد مذہب ہے جو وجودِ نسواں سے متعلق مثبت اور منصفانہ فکر و نظر پیش کرتے ہوئے عورت کو حقوق، عظمت اور وقار عطا کرتا ہے۔ مغربیت نے صنفِ نسواں سے متعلق جتنے بھی فلسفے اور نظریات پیش کیے ہیں۔ ان تمام میں سے سب سے زیادہ قرین فطرت مقام و مرتبہ اور حقوق و فرائض نسوانی صنف کو اسلام ہی کی مرہونِ منت ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

"مجھے تین چیزیں محبوب ہیں: خوشبو، عورت اور نماز۔"[۱۰]

عورت کی عزت و حقوق کے بارے میں ایک حدیث میں صریحاً اعلان کیا گیا کہ:

"اللہ نے حرام کی ہے تم پر ماؤں کی نافرمانی، ادائیگی حقوق سے دست برداری اور ہر طرف سے ذخیرہ اندوزی اور لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا۔"[۱۱]

ان تمام بنیادی حقائق کے برعکس مغربی دنیا کا اسلام کے ساتھ ایک معاندانہ رویہ رہا ہے۔ اس کا اندازہ حال ہی میں فرانس کے خواتین پر پردے کی پابندی کے قانون کے نفاذ پر لگایا جا سکتا ہے اور اس قانون کی خلاف ورزی کرنے پر جرمانہ عائد کیا گیا ہے۔ فرانس کی پارلیمنٹ نے پردے کے خلاف کی گئی قانون سازی کی وجوہات پیش کی ہیں کہ چہرے کا پردہ فرانس کے اقدار کے خلاف ہے اور اس سے فرانسیسی قوانین کے مطابق مرد اور عورت کی تفریق ہوتی ہے۔ پردہ عورتوں کی آزادی چھین کر انہیں قیدی بنا دینے کے مترادف ہے۔ یہ عورتوں کو زبردستی تابعدار اور فرمانبردار بنا دیتا ہے۔ پردہ عورتوں کو ان کی بنیاد سے ہٹا دیتا ہے۔ سماجی زندگی میں انہیں ان کی شناخت سے بھی دور کر دیتا ہے اور اس سے فرانسیسی ثقافت کی توہین ہوتی ہے۔

امریکی صحافی اور نسائی ادب کی مصنفہ Naomi Wolf "ناومی والف"[۱۲] خواتین کی آزادی اور معاشرے میں ان کی عزت و احترام کے قیام کے لیے کام کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے دو کتابیں بھی لکھی۔ "The Beauty Myth (1990)" اور "Give me Liberty(2008)"۔ مختلف مذاہب اور تہذیبوں میں خواتین کے مقام و مرتبہ کا مطالعہ و مشاہدہ ان کا پسندیدہ شغف ہے۔ پردے کے حوالے سے ایک مسلم ملک میں مسلم لباس کا تجربہ انہوں نے یہ دیکھنے کے لیے کیا کہ اس لباس میں عورت خود کو کیا محسوس کرتی ہے۔ اس تجربے سے انہوں نے خود کو محفوظ اور آزاد محسوس کیا۔ مسلم خواتین، پردہ اور جنس کے موضوع پر اپنے آرٹیکل

میں ناومی والف نے اہلِ مغرب کو مشورہ دیا ہے کہ مسلم اقدار کو دیانت داری کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں۔ پردے کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ عورت مجبور یا قیدی ہے بلکہ دینِ اسلام نے عورت کو پردے میں رکھ کر اسے تحفظ دیا ہے۔ اسے گھر کی چار دیواری میں مقید نہیں کیا بلکہ اس پر اپنے خاندان کے ارتقاو تشکیل کی اہم ذمہ داری ڈالی ہے۔ اس حوالے سے علامہ اقبال کے نزدیک کہ عورت کو اجنبی نگاہوں سے محفوظ رکھا جائے۔ عورت ایک عظیم ذریعۂ تخلیق ہے اور یہ حقیقت ہے کہ کائنات کی تمام تخلیقی قوتیں مستور اور محجوب ہیں۔

عورت شعور انسانیت کی تعمیرِ نو کی معمار ہے اور معاشرے کی حقیقی معمار بھی۔ اسلام نے عورت کو وہ تمام حقوق دیئے ہیں جن سے مستفید ہو کر وہ خاندانی نظام، معاشرتی، سیاسی اور سماجی اقدار بخوبی تعمیر و تشکیل کر سکتی ہے کیونکہ قرآن حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں عورت کا معاشرتی کردار ہے جو عورت کو خاندانی اخلاقی استاد قرار دیتا ہے۔ اس ضمن میں (Soviet Union)"سوویت یونین" [۱۳] کے آخری صدر گورباچوف (Mikhail Gorbachev) نے "*Perestroika (1987)*" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس کا ایک باب عورتوں کے بارے میں تھا۔ "Status of Women" اس باب میں میخائل گورباچوف کے خیال میں مغرب کی سوسائٹی میں عورت کو گھر سے باہر نکالا گیا اور اس کو گھر سے باہر نکالنے کے نتیجے میں کچھ معاشی فوائد حاصل کیے اور پیداوار میں کچھ اضافہ ہوا، اس لیے مرد بھی کام کر رہے ہیں اور عورتیں بھی کام کر رہی ہیں۔ لیکن پیداوار کے زیادہ ہونے کے باوجود اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ فیملی سسٹم تباہ ہو گیا اور اس فیملی سسٹم کے تباہ ہونے کے نتیجے میں جو نقصانات اٹھانے پڑے ہیں، وہ نقصانات ان فوائد سے زیادہ ہیں جو پروڈکشن کے اضافے کے نتیجے میں حاصل ہوئے۔ [۱۴]

اگر تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو جنسی مساوات کا مغربی نعرہ سرمایہ دارانہ نظام کی ایک منطقی ضرورت کے طور پر وجود میں آیا۔ صنعتی دور میں کم مزدوری پر کام کرنے والی افرادی قوت کی ضرورت کو پورا کیے بغیر سرمایہ دارانہ نظام خود کو مستحکم نہ رکھ سکا۔ اس لیے خواتین کو گھر سے نکال کر کارخانوں میں محنت کشی اختیار کرنے کو آزادی حریت اور ترقی کا نام دے کر خواتین کو تجارتی کارکن بننے کی دعوت دی گئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ اور مغربی معاشرے کا خاندانی اور اخلاقی نظام تباہ ہو گیا۔ معاشرتی انتشار اور خواتین کے حقوق کی پامالی، مغربی معاشرے کے بگاڑ کا باعث بنی۔

اس کے برعکس اگر دیکھا جائے تو اسلام نے پوری دنیا کے سامنے حقوق نسواں کا حسین تصور پیش کیا۔ چنانچہ اس سے متاثر ہو کر غیر مسلم مفکرین بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اسلام ہی دراصل حقوق نسواں کا علم بردار اور حقیقی ضامن ہے۔ اسلام ہی واحد ایسا مذہب ہے جو صنفِ نازک کا نجات دہندہ اور حقوق نسواں کا پاسدار ہے۔ اس سلسلے میں چند غیر مسلم فلسفی و مفکرین یوں رقم طراز ہیں: [۱۵]

ای بلائیڈن:

سچا اور اصلی اسلام جو محمد ﷺ لے کر آئے۔ اس نے طبقہ نسواں کو وہ حقوق عطا کیے جو اس سے پہلے اس طبقہ کو پوری انسانی تاریخ میں نصیب نہیں ہوئے تھے۔

(سنتِ نبوی اور جدید سائنس)

ڈبلیو لائٹر:

"عورت کو جو تکریم اور عزت محمد ﷺ نے دی وہ مغربی معاشرے اور دوسرے مذاہب اسے کبھی نہ دے سکے"۔

(Mohammadanism in religious system of the world)

ای ڈرمنگھم:

"اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ محمد ﷺ کی تعلیمات نے عربوں کی زندگی بدل دی، ان سے پہلے طبقہ نسواں کو کبھی وہ احترام حاصل نہیں ہو سکا تھا جو محمد ﷺ کی تعلیمات سے انہیں حاصل ہوا۔ جسم فروشی، عارضی شادیاں اور آزادانہ محبت ممنوع قرار دے دی گئیں۔ لونڈیاں اور کنیزیں جنہیں اس سے قبل محض اپنے آقاؤں کی دل بستگی کا سامان سمجھا جاتا تھا، وہ بھی حقوق و مراعات سے نوازی گئیں"۔

(The Life of Mohammad)

ڈبلیو ڈبلیو کیش:

"اسلام نے عورتوں کو پہلی بار انسانی حقوق دیے اور انہیں طلاق کا حق دیا."

(The Eupensin of Islam)

تاہم مغربی مفکرین اس حقیقت کے معترف ہیں کہ اسلام نے عورتوں کے لیے تمام معاشی، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی حقوق مقرر کر کے انہیں معاشرے میں عظمت اور اعلیٰ مرتبے اور مقام سے نوازا ہے۔

لہٰذا اقبال کا تصور عورت، تانیثی تحریک کے تقابل میں اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ عورتوں کی آزادی اور ان کے حقوق کے بارے میں اسلام میں ایک مکمل ضابطۂ اخلاق موجود ہے اور وہ ضابطۂ اخلاق کسی بھی طرح عورت کی آزادی کو ختم اور سلب نہیں کرتا اور نہ ہی جدید دور کے تقاضوں سے متصادم ہے۔ جہاں بھی معاشرے نے عورت کے حوالے سے اسلامی ضابطۂ اخلاق سے انحراف کیا تو اس کے برے نتائج ظاہر ہوئے۔ علامہ اقبال بھی یہی چاہتے تھے کہ مسلمان عورت کے سامنے فاطمہ بنت محمد ﷺ کا کردار اور مثالی نمونہ ہو نہ کہ مغربی معاشرے کی عورت کا۔ اگر اقبال عملی زندگی میں عورت کی آزادی اور ترقی کے خلاف ہوتے تو وہ کبھی بھی فاطمہ بنت عبداللہ کے کردار کو خراجِ

تحسین پیش نہ کرتے۔ اقبال مغربی افکار کے حوالے سے عورت اور مغرب کے ان پہلوؤں کو زیرِ تنقید لاتے ہیں جو فطرت اور اسلام دونوں کے خلاف ہیں۔ انہیں عورتوں کی ترقی اور آزادی سے کوئی عناد نہیں۔ اگر وہ ترقی اور آزادی اسلام اور فطرت کے متعین کردہ حدود میں ہو اور یہی تقاضادینِ فطرت کا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ علامہ اقبال، "تعلیم عورت" ضرب کلیم، کلیات اقبال اردو، (الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۲۰۱۲ء، ص ۴۱۱۔

۲۔ ایضاً، ص ۴۶۰۔

۳۔ البقرہ، ۱۸۷

۴۔ النساء، ۳۴

۵۔ A British American historian specialized in Oriental studies. [3] He was also known as a public intellectual and political commentator.

۶۔ Bernard Lewis (2002), What Went Wrong?, ISBN 0-19-514420-1, pp. 82-83

۷۔ ڈاکٹر عبدالمغنی فاروق، "تحریک آزادی نسواں پر اقبال کی تشویش"، اسلامک ریسرچ اکیڈمی، ۲۰۰۷ء۔

۸۔ بحوالہ: مفتی محمد تقی عثمانی، "اصلاحی خطبات"، جلد: ۱، ص ۱۴۱۔

۹۔ مشکاتہ المصابیح، جلد: ۷، حدیث# ۵۲۶۱

۱۰۔ البخاری

۱۱۔ Naomi Rebekah Wolf is an American feminist author and journalist. Following her first book The Beauty Myth, she became a leading spokeswoman of what has been described as the third wave of the feminist movement.

۱۲۔ The Soviet Union, officially the Union of Soviet Socialist Republics, was a socialist state that spanned most of Europe and Asia during its existence from 1922 to 1991

۱۳۔ A Russian and former Soviet politician.

۱۴۔ بحوالہ: مفتی محمدؐ تقی عثمانی، "اصلاحی خطبات"، جلد: ۱، ص ۱۴۸۔

۱۵۔ بحوالہ: تنویر خالد قاسمی، "اسلام میں عورتوں کے حقوق: غیروں کی نظر میں" ماہنامہ الحق، سیتا سڑھی بہار، ۲۰۱۰ء۔

ماحصل

ماحصل

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نسوانیت کے بغیر انسانیت کی تکمیل ممکن ہی نہیں۔ نسوانیت سے مستعار ماں کا مقام، یہ اتنا بڑا منصب ہے کہ جنت جیسی خوب صورت جگہ بھی اس کے قدموں کے تلے آن ٹھہری۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اقتدار کے لیے، اپنے خزانوں کے لیے، اپنی طاقت کے لیے یا اپنے غضب کے لیے کوئی مثال پیش نہیں کی ہے سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے لیے ماں کی محبت کو مستعار لیا کہ ماں سے ستر گنا زیادہ محبت کرنے والا۔ جنت سے بڑھ کر کوئی خوب صورت مقام اس کائنات میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدمؑ کو اس مقام پر جگہ عطا کی تو انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں تنہائی کی شکایت کی۔ جس کے بعد انہیں حضرت حواؑ کی معیت عطا کی گئی۔ یہ نظام قدرت ہے کہ مرد عورت کے بغیر اور عورت مرد کے بغیر نامکمل ہے۔ دونوں کے اختلاط سے ہی اس دنیا میں نسل انسانی کی بقا ممکن ہے اور دونوں کا اشتراک، تہذیب و تمدن کے ارتقا کے لیے بے حد ضروری ہے۔

عورت ایک حسین شعریت اور روحانی و قلبی سکون کا نام ہے۔ عورت کی تخلیق نظامِ کائنات کی تخلیق ہے۔ جس کا مسلک وفاداری، جس کا مذہب محبت اور جس کا فرض انسان سازی ہے۔ اقبال نے عورت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اس کی بنیاد قرآن و حدیث ہے۔ اردو شاعری میں اقبال نے عورت کی عزت و عظمت اور قدر و منزلت کو بیان کیا اور فرمایا کہ عورت ہی کی پیشانی کے خط میں ہماری قومی تقدیر پوشیدہ ہے۔ اقبال کی نظر میں عورت کی عظمت کا راز اس کے فرض امومت کی ادائیگی میں ہے۔ اقبال کو عورت کا مقام امومت پسند ہے اور اسی مقام کی فرضیت پر زور دیتے ہوئے عورت کو نسل انسانی کے بقا کی ضامن قرار دیا ہے۔ اقبال معاشرتی زندگی میں عورت کی مرکزی حیثیت اس کے ماں ہونے کو سمجھتے ہیں۔ جس کا اظہار انہوں نے اپنی نظم "ماں کی دعا" میں کیا۔ "رموز بے خودی" کے اختتام پر عورت کی حمایت اور عزت افزائی اپنی درد بھری مثنوی میں کی ہے۔ اسی طرح اپنی تصانیف جاوید نامہ، ضربِ کلیم، بانگِ درا اور ارمغانِ حجاز میں عورت کے موضوع پر بڑے مدلل انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اپنی انگریزی یادداشتوں شذرات، فکرِ اقبال میں انہوں نے عورتوں کے لیے ایک بھرپور نظامِ تعلیم کی ضرورت بتائی ہے۔ اقبال بھی عورت کی اس مسلمہ حیثیت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کے جمال اور حیاتیاتی اوصاف کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی میں سوز دروں

عورت کو چونکہ صرف عورت بننے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس لیے اسے مردانہ اوصاف نہیں دیئے گئے۔ مرد اور عورت کے قدرتی فرائض کو مد نظر رکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قدرت نے دونوں صنفوں کو اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق مختلف فرائض سونپے ہیں۔ ان فرائض میں سے سب سے اہم فرض امومت کا ہے جس پر تمام کائنات کا انحصار ہے۔ اسی اہم فرض کی وجہ سے عورت کا مقام معاشرے میں بہت ہی بلند وارفع ہے۔ جس طرح ایک قیمتی اور نایاب چیز کی حفاظت ضروری ہوتی ہے۔ اسی طرح قدرت نے مرد کو عورت جیسی نایاب اور گراں قدر دولت کی حفاظت کا فرض عطا کیا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم میں مرد کو عورت کا قوام کہا گیا ہے۔ مذہبی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو عورت مرد کے مقابلے میں نہایت راسخ العقیدہ ہوتی ہے۔ اقبال کی نظر میں عورت مذہبی روایات کی امین ہے۔ ان ہزار خوبیوں اور اوصاف کے، مرد اس مغالطے میں ہیں کہ قدرت نے مردوں کو عورتوں کا حاکم بنایا ہے۔ اسی تصور نے عورتوں کو مردوں کے ظلم و ستم کا شکار بنا رکھا ہے۔ حالانکہ قرآن حکیم نے مردوں کو عورتوں کا حاکم نہیں بلکہ ان کا محافظ اور قوام بنایا ہے۔ تاکہ وہ جوہر نسوانیت کا محافظ بن کر ملک و قوم کے لیے بہترین نسل مہیا کرنے میں عورت کا مددگار ثابت ہو سکے۔

قومیں افراد سے بنتی ہیں جن کی پیدائش اور تربیت کا انحصار ماں پر ہے۔ مائیں اپنی اولاد کی اعلیٰ پرورش کر کے قوم کو بہترین افراد مہیا کر سکتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ صرف ماں ہی وہ مقدس ہستی ہے جو ایک باکردار اور بلند اخلاق کے بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے اور یہی چیز معاشرے میں عورت کی افادیت کا ثبوت ہے۔ لہٰذا جب تک عورت صحیح معنوں میں معاشرے میں اپنی اہمیت اور افادیت کا احساس اپنے دل میں پیدا نہیں کرتی۔ اس وقت تک وہ احساس کمتری کے باعث مجسمۂ مظلومیت بنی رہتی ہے۔ اسی لیے اقبال نے جہاں مردوں کو عورتوں کی قدر و منزلت کا احساس دلایا ہے، وہاں عورتوں کو بھی یہ تلقین کی ہے کہ وہی دراصل کائنات کی رنگ و بو کا باعث ہیں اور انہی کی وجہ سے دنیا میں چہل پہل اور رونق ہے۔ لہٰذا وہ اپنے بلند اوصاف کی بنا پر معاشرے میں ایسا کردار ادا کریں جس کے لیے قدرت نے انہیں پیدا کیا ہے۔

معاشرے میں جہاں مرد کا وجود معاشی مسائل اور مشکلات کو حل کرنے کے لیے ضروری ہے تو عورت کا وجود معاشرتی زندگی کے قیام اور بقا کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ تہذیب کے ارتقا میں عورت کی فطرت، مرد کی فطرت سے کہیں زیادہ بلند واقع ہوئی ہے۔ عورت سراپا فرض، قربانی اور قناعت کی تصویر ہے۔ وہ اپنی ذات اور اپنے آرام و آسائش کو ترک کر کے اپنی اولاد اور خاندان کی عزت و وقار کی عظمت کے لیے مصروفِ عمل رہتی ہے لیکن افسوس! وہ عورت جو باعث تخلیق کائنات ہے، اسے آج باعث تخریب معاشرہ بنا دیا گیا ہے۔ اقبال اس تخریب کاری کی نشاندہی کرتے ہوئے ایک طرف مشرق و مغرب کو عورت کی عظمت کا احساس دلاتے ہیں اور دوسری طرف مسلمان

عورتوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے مسلمان عورت! تو اپنے حقیقی منصب اور مقام کو خودی اور آگاہی کے دائرے میں رہ کر پہچان اور حضرت فاطمہؓ بنت محمد ﷺ کی زندگی کی پیروی میں زندگی کی شاہراہ پر گامزن رہ تاکہ تیری آغوش میں حسنؓ اور حسینؓ فرزند پرورش پا سکیں اور تو قوم کے لیے باعث فخر ہستی ثابت ہو سکے۔ یہی طرزِ زندگی انہیں اپنے بلند مقام و مرتبے پر فائز رہنے میں معاون و مددگار ہو سکتا ہے اور اسی طریقے سے مسلمان عورت اپنا وقار اور عظمت قائم و دائم رکھ سکتی ہے۔

عورت کے مسائل اور محرومیاں ہمیشہ سے ہی انسانوں کا موضوع رہی ہیں اور ہر مفکر و فلسفی نے اسے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ قدیم یونان میں تو صدیوں سے یہ بحث چلتی رہی کہ عورت انسان بھی ہے کہ نہیں اور اس دور کی کتنی ہی کتب آج بھی اس بحث کو پیش کرتی ہیں۔ ہمیشہ کی طرح آج کے یورپی تہذیب کے انسانی دماغوں نے بھی عورت کے مسائل کا حل تلاش کیا۔ کم و بیش تین سو سالوں سے یورپی تہذیب نے عورت کو حقوق نسواں کے نام سے ایک آزادی دے رکھی ہے تاکہ اس کے مسائل حل ہو جائیں۔ اس کے برعکس آزادئ نسواں کو اگر مغربی تناظر میں دیکھا جائے تو جہاں سے تانیثی تحریک کا تصور ابھرا، وہ افراط و تفریط کا شکار ہونے کے باعث بہت غیر متوازن ہے کیونکہ مغربی معاشرے کی عورت کو وہ تمام حقوق حاصل نہ تھے جو ایک اسلامی معاشرے کی عورت کو حاصل ہوتے ہیں۔ اسی کو بنیاد بناتے ہوئے مرد و عورت کی مساوات کے لیے مغرب میں آزادی نسواں کی تحریک شروع ہوئی۔ تاہم اس تحریک کا نتیجہ بے مہار آزادی کی صورت میں یوں برآمد ہوا کہ عورت تمام فطری اور اخلاقی قیود سے آزاد ہو گئی۔ جس کی وجہ سے معاشرہ بے حیائی اور بے راہ روی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔

آزادئ نسواں اور مساوات حقوق کی یلغار دورِ حاضر کا طرۂ امتیاز ہے۔ اہلِ مغرب نے اس موضوع کو حمایتی انداز میں پوری دنیا تک پھیلایا اور مرد و عورت کی برابری کے نعرے بلند کیے۔ اس کے برعکس اگر دیکھا جائے تو اسلام نے عورت کو جو مقام و عظمت عطا کیا ہے وہ دنیا کے کسی مذہب، کسی تہذیب اور کسی معاشرے نے نہیں کیا۔ قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث مبارکہ میں عورت کے مقام و مرتبہ کو جس حکمت اور بصیرت سے متعین کر دیا گیا ہے۔ اسی کا حوالہ دے کر اقبال نے مقام نسائیت کو بہت خوب صورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ علامہ اقبال وہ دانش ور ہیں جنہوں نے مختلف تہذیبوں اسلام اور مغرب کے مطالعے کے حوالے سے غیر معمولی فکری گہرائی، توازن اور غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے افکار و تصورات پیش کیے۔ اپنے مفکرانہ انداز سے زندگی کے بہت سے مسائل حل کرنے کی کوشش کی۔ جن میں ایک اہم مسئلہ خواتین کے مسائل بھی ہیں۔

اقبال نے معاشرے کے بنیادی اور اہم کردار عورت کے مقام و مرتبے کی پہچان کو اہمیت اور حیثیت دی۔ عورت کے وجود کو مختلف جہتوں سے آشکار کرتے ہوئے اپنے کلام میں بارہا ذکر کیا۔ اقبال نے عورت کا جو تصور پیش کیا

ہے، وہ اسلام میں عورت کے تصور کا آئینہ دار ہے جو مقام اور مرتبہ، اہمیت و عظمت اسلام نے عورت کو دی ہے، شاعر مشرق اور مفکر اسلام کے کلام میں بھی یہی نظریہ کارفرما نظر آتا ہے۔ عورت کی شجاعت اور بہادری کی مثال اقبال نے اپنی ایک نظم "طرابلس کی جنگ" میں فاطمہ بنت عبداللہ کی شہادت کی صورت میں پیش کی ہے۔ اقبال کی نظر میں عورت کا ایک مخصوص دائرہ ہے اور اسلام کے اسی مقرر کردہ دائرہ کار میں رہتے ہوئے عورت ایک بہترین اور اصلاحی معاشرے کی تشکیل کر سکتی ہے۔ اقبال عورت کے لیے تعلیم کو ضروری قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ تعلیم کا نصاب ایسا ہو جو عورت کو اس کے فرائض اور اس کی صلاحیتوں سے آگاہ کرے اور اس کی بنیاد دین کے اصولوں پر ہو۔

مسلمان معاشرے میں خواتین علم سے دور ہیں۔ فکر اور تدبر سے عاری ہیں۔ انہیں جو کہا جاتا ہے اس کی اندھا دھند تقلید کرتی ہیں لہذا عورتوں کے لئے اسلام کی تعلیمات حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ عورتوں کو اس قابل ہونا چاہئے کہ وہ قرآن مجید اور حدیث کا خود مطالعہ کر سکیں۔ تاکہ قرآنی احکامات اور احادیث کی روشنی میں اپنے کردار اور سیرت کو مزین کریں۔ نیز اسلامی روایات و اقدار کی اہمیت کو جان سکیں کیوں کہ اسلامی معاشروں میں موجود آزادی نسواں کی تحریک کے علمبرداروں کے خلاف نسوانی حقوق کی وجہ سے جو تعصب پایا جاتا ہے، وہ اسلامی تعلیمات سے دوری کا نتیجہ ہے۔ معاشرے میں عورت کے کردار کو متعین کرنے میں علماء اور دانشوروں کا فعال کردار ہے۔ اگر وہ اسلامی احکام کی صحیح تقسیم کر کے عوام الناس تک صحیح رہنمائی پہنچائیں تو عورت کے دائرہ کار اور اس کی معاشرتی حیثیت کے بارے میں کسی قسم کا کوئی ابہام پیدا نہ ہو۔ اسلام نے زندگی کے شعبوں میں مرد اور عورت میں کوئی تخصیص نہیں رکھی۔ شرط طریقہ کار کی ہے۔ عورت اسلامی شریعت کے متعین کردہ حدود و قیود کے مطابق اپنی مہارت اور ہنرمندی کے جوہر دکھا سکتی ہے۔ تمدنی ارتقاء کے پیش نظر ضروری ہے کہ خواتین سماجی، سیاسی مشاغل میں شرکت کریں۔ ان کی شرکت معاشرتی ترقی کی ضمانت ہے۔ عورت کا زندگی میں کردار محض صنفی امتیاز پر مبنی نہیں بلکہ اس کے اپنی الگ تشخص پر بھی ہے۔ قرآن نے عورتوں کو صنفی اور انسانی دونوں لحاظ سے بلند مقام عطا کیا ہے۔ عورت کسی بھی لحاظ سے کمتر اور حقیر نہیں۔ معاشرے کا عورت کے بارے میں افراط و تفریط پر مبنی رویہ ہی دراصل عورتوں کا استحصال ہے۔ عورتوں کو اپنے مقاصد کا تعین کرنے میں آزاد ہونا چاہیے۔

اقبال کے تمام نظریات کی بنیاد خالصتاً اسلامی تعلیمات پر ہے۔ اس لیے وہ عورت کے لیے وہی تصور پیش کرتے ہیں جس کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔ اقبال نے عورت کے مقام و مرتبے کا مشرق و مغرب کے ماحول کے حوالے سے جو موازنہ کیا ہے وہ نہایت جامع اور خوب صورت ہے۔ حقیقت نسواں، مقام نسواں، تعلیم نسواں، حقوق نسواں اور اہمیت نسواں کے حوالے سے اقبال نے اپنے کلام کے ذریعے مختلف خطبات، مقالات، ملفوظات و شذرات اور مختلف نظمیں فلسفۂ غم، ظریفانہ، والدہ مرحومہ کی یاد میں، خلوت، عورت، مرد فرنگ، پردہ، ایک سوال، آزادیٔ

نسواں، عورت کی آزادی، عورت کی حفاظت، عورت اور تعلیم اور ہنر وران ہند میں ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اکتوبر ۱۹۰۶ء میں شائع ہونے والا ادبی جریدہ مخزن میں اقبال کا پہلا مضمون "قومی زندگی" کے نام سے شائع ہوا جس میں اقبال نے عورت کے معاشرتی مقام و کردار اور حقوق و فرائض کے موضوع پر اپنے نظریات پیش کیے۔ اقبال عظمت نسواں کے قائل تھے۔

تحقیق کا بنیادی مقصد اقبال کے تصورِ عورت کی اصل روح کو صحیح طرح سے سمجھ کر اس کی تفہیم ہے کیونکہ اقبال پر یہ اعتراض جدت پسند حلقوں کی جانب سے اکثر کیا جاتا رہا ہے کہ اقبال عورت کو جدید معاشرے میں ان کا صحیح مقام دینے کے حامی نہیں تھے۔ انہوں نے تصور عورت کو پیش کرتے ہوئے تنگ نظری اور تعصب سے کام لیا اور آزادیٔ نسواں کی مخالفت کی۔ یہ اعتراض وہ لوگ کرتے ہیں جو آزادیٔ نسواں کے صرف مغربی تصور کو پیشِ نظر رکھتے ہیں اور اس معاشرتی مقام و عظمت سے بے خبر ہیں جو دینِ اسلام نے عورت کو دیا ہے۔

اقبال عورت کے حقوق اور تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی حقیقی آزادی اور ترقی کے خواہاں بھی ہیں لیکن آزادی نسواں کے مغربی تصور کو قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اس آزادی سے ان کی نظر میں عورتوں کی مشکلات آسان نہیں بلکہ مزید پیچیدہ ہو جائیں گی کیونکہ مغربی معاشرے میں وہ تمام حقوق عورت کو میسر نہیں جو ایک اسلامی معاشرے میں رہتے ہوئے عورت کو حاصل ہیں۔

اسلام میں مرد و عورت میں، جان و مال میں اور عزت و اعتبار کی حیثیت سے کوئی فرق نہیں ہے۔ تاہم کچھ فرائض اور مناصب کی ادائیگی کے لحاظ سے مرد کو عورت کے مقابلے میں اسلام نے قوام کی حیثیت عطا کی ہے۔ اقبال تعلیمِ نسوان کے بہت بڑی حامی تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ عورتوں کو تعلیم یافتہ ہونا چاہیے کیونکہ ایک تعلیم یافتہ عورت سات نسلوں کی بہترین تربیت کر سکتی ہے۔ اسی کے وجود سے ایک بہتر قوم تشکیل پا سکتی ہے اور اس کے برعکس اگر عورت تعلیم یافتہ نہیں ہو گی تو پوری قوم تباہ و برباد ہو جائے گی۔ اسی ضمن میں فرانس کے مشہور عالم شہنشاہ نپولین بونا پارٹ نے کہا تھا کہ:

"مجھے عظیم، پڑھی لکھی مائیں دو، میں تمہیں ایک عظیم اور تربیت یافتہ معاشرہ دوں گا"۔

ایک تعلیم یافتہ عورت سے ایک بہتر معاشرے کی تشکیل ہوتی ہے۔ اسی حوالے سے اقبال فرماتے ہیں کہ عورتوں کو تعلیم سے مزین کرو تاکہ ایک مہذب اور ترقی یافتہ معاشرہ وجود میں آئے۔

کسی بھی معاشرے کی ترقی کے لیے تعلیم لازمی ہے۔ اقبال دراصل عورتوں کی تعلیم کے خلاف نہ تھے بلکہ وہ صرف ان طریقوں کے خلاف تھے جو آزادیٔ نسواں کی تحریک نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اختیار کر رکھے

تھے۔ ایسی تعلیم ہو جس سے شخصیت میں نکھار پیدا ہو نا کہ مغربی تہذیب کو اپنایا جائے جس سے بے حیائی اور غیر ذمہ داری کو فروغ ملے۔

غرض یہ کہ جن مسائل اور حقوق واختیارات کے تناظر میں فرانس، برطانیہ، امریکہ اور پورے مغرب میں تانیثی تحریک شروع ہوئی تھی۔ وہ تمام حقوق اور مسائل دینِ اسلام اس تحریک سے بارہ سو صدیاں پہلے ہی حل کر چکا تھا۔ جب کہ مغربی معاشرہ دو صدیوں پر محیط طویل جدوجہد کے بعد ان حقوق واختیارات کے حصول میں کامیاب ہوا اور وہ بھی ناقص اور فی الوقتی صورت میں۔ مغرب کی اس تحریک کے نتیجے میں مرد و عورت ایک دوسرے کے مد مقابل آ گئے، جس کے باعث معاشرہ بے راہ روی اور انتشار کا شکار ہو گیا جب کہ اس کے برعکس اسلام کا معاشرہ یکسر محفوظ اور پُر امن رہا۔

کتابیات

کتابیات

احمد داڑ، بشیر۔ انوار اقبال۔ کراچی، ۱۹۶۷ء۔

احمد، اسرار۔ اسلام میں عورت کا مقام۔ لاہور: مرکزی انجمن خدام القرآن، ۱۹۸۹ء۔

احمد، مرزا خلیل۔ "تانیثی تنقید" مشمولہ مخزن، نومبر، ۲۰۱۳ء۔

احمد، مرزا خلیل۔ "تانیثیت" مشمولہ مخزن۔ نومبر، ۲۰۱۲ء۔

اختر، سلیم۔ پاکستانی شاعرات: تخلیقی خدوخال۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔

اختر، سلیم۔ علامہ اقبال: حیات فکر و فن۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔

اختر، نسرین۔ اقبال اور وجودِ زن۔ ادارۂ تحقیق و تصنیف پاکستان، ۱۹۷۸ء۔

اقبال، محمد۔ اسلامی فکر کی نئی تشکیل۔ مترجم: شہزاد احمد، لاہور: مکتبۂ خلیل، ۲۰۰۱ء۔

اقبال، جاوید۔ خطبات اقبال: تسہیل و تفہیم۔ سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔

آصف، محمد۔ اسلامی اور مغربی تہذیب کی کشمکش: فکر اقبال کے تناظر میں۔ ملتان: بہاؤالدین زکریا یونی ورسٹی، ۲۰۰۹ء۔

بدایونی، ضمیر علی۔ مابعد جدیدیت کا دوسرا رُخ۔ کراچی: ایجوکیشنل پریس، ۲۰۰۶ء۔

بریلوی۔ عبادت۔ اقبال کی اُردو نثر۔ لاہور: زرین آرٹ پریس، ۱۹۷۷ء۔

بی بی، تحسین اور نوشین صفدر۔ "عورت، فکر اقبال کے تناظر میں" مشمولہ پیغام آشنا، اپریل تا جون، ۲۰۱۸ء۔

پاشا، انور (مرتب)۔ تانیثیت اور ادب۔ دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء۔

تبسم، ہارون الرشید۔ نویرۂ اقبال۔ جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۷ء۔

تنولی، طاہر حمید۔ جوئے رواں (اشاریہ کلیات اقبال اردو)۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۰ء۔

تونسوی، طاہر۔ اقبال شناسی اور نیاز و نگار۔ لاہور: ظفر سنز پرنٹرز، ۱۹۹۸ء۔

ٹراٹسکی، لیون۔ عورت اور خاندان۔ مترجم: ریاض کشمیری، انٹرنیٹ ایڈیشن، ۲۰۰۶ء۔

جاوید، عقیلہ۔ اردو ناول میں تانیثیت۔ ملتان: یوسف مرید پرنٹنگ پریس، ۲۰۰۵ء۔

جعفری، سیّد۔ "اقبال اور عورت" مشمولہ نگار، اکتوبر ۱۹۸۲ء۔

جہاں، قیصر (مرتب)۔ اردو میں نسائی ادب کا منظر نامہ۔ علی گڑھ: شعبۂ اُردو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، ۲۰۰۴ء۔

جین، جسبیز۔تحریک نسواں: ثقافت، موضوعیت اور نمائندگی۔مترجم:اعزاز باقر،لاہور: مشعل بکس،۲۰۱۴ء۔

حسن،فاطمہ(مرتبہ)۔تانیثیت اور ہم۔کراچی:وعدہ کتاب گھر،۲۰۰۵ء۔

حسن،فاطمہ۔فیمینزم اور ہم: ادب کی گواہی۔کراچی:وعدہ کتاب گھر،۲۰۱۳ء۔

حسین سیال،طالب۔ابلاغ خطبات اقبال :فکر اسلامی کی تشکیل نو۔اسلام آباد:اقبال بین الاقوامی ادارہ برائے تحقیق و مکالمہ،بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی،ستمبر ۲۰۲۰ء۔

حسین،الطاف۔اقبال اور اسلامی معاشرہ۔سری نگر:گلشن پبلشرز،۱۹۹۵ء۔

حسین،سیّد شرافت۔عورت، مذہب اور حکومت۔لاہور:نسیم بک ڈپو،۲۰۰۲ء۔

حسین،مظفر۔اساس فکر اقبال۔لاہور:آل پاکستان ایجوکیشن کانگریس۲۰۱۶۔

خان سیال،حیات اور شمیم حیات سیال(مرتبین)۔تجلیات اقبال (فرمودات اقبال)۔لاہور:نذر سنز، ۲۰۰۰ء۔

خان،محمد احمد۔اقبال اور مسئلہ تعلیم۔لاہور:اقبال اکادمی پاکستان،۱۹۷۸ء۔

خان،احسان اللہ۔اسلام میں عورت کا مقام و مرتبہ۔دہلی:فوٹولیتھو ورکس،سیماپوری،۱۹۸۴ء۔

خورشید،عبدالسلام۔سرگزشت اقبال۔لاہور:اقبال اکادمی،۱۹۷۷ء۔

راشد،سعید۔ مکالمات اقبال۔جہلم:بک کارنر پبلشرز،۱۹۸۸ء۔

رفیق افضل،محمّد۔گفتار اقبال۔لاہور:ناشر ادارہ تحقیقات پاکستان،۱۹۶۹ء۔

ریاض،فہمیدہ۔ادب کی نسائی ردتشکیل۔کراچی:وعدہ کتاب گھر،۲۰۰۶ء۔

زیدی،سیدہ نغمہ۔"علامہ اقبال کی نظر میں عورت کا مقام"مشمولہ پیغام آشنا،نومبر ۲۰۱۳ ء۔

سرپرہ،عبدالودود۔"جدید تحریک نسواں اور اسلام"مشمولہ معارف۔جولائی تا دسمبر ۲۰۱۷ء۔

سعید،حمیرا۔اردو ناولوں میں نسائی حیثیت۔دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۲۰۱۵۔

سہگل،روبینہ۔عورت اور مزاحمت۔لاہور: مشعل بکس،۱۹۹۹ء۔

سہیل عمر،محمّد۔خطبات اقبال:نئے تناظر میں۔لاہور:اقبال اکادمی،۱۹۹۶ء۔

سیال،طالب حسین۔اقبال اور انسان دوستی۔کراچی:اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس،۲۰۰۳ء۔

شبیر،رانا غلام۔"اردو ادب میں تانیثیت کی روایت"مشمولہ پیغام آشنا،اپریل تا ستمبر ۲۰۱۳ء۔

شہید۔سیّد قطب۔اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل(مترجم)۔ساجد الرحمٰن صدیقی،لاہور:

مکتبۂ تعمیر انسانیت، ۱۹۹۵ء۔
صائمہ، منیبہ اور ناہید قمر۔ "اقبال کی نظر میں حیثیت نسواں" مشمولہ پیغام آشنا، اپریل تا جون ۲۰۱۸ء۔
صدیقی، ابواللیث۔ ملفوظات اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۷۷ء۔
صدیقی، بختیار حسین۔ اقبال بحیثیت مفکر تعلیم۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۳ء۔
صدیقی، صالحہ۔ اردو ادب میں تانیثیت کی مختلف جہتیں۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۴ء۔
عابد، قاضی۔ اردو ادب اور تانیثیت۔ اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء۔
عارف، نجیبہ۔ "نسائی شعور کا قضیہ" مشمولہ بنیاد، جلد ۷، ۲۰۱۶ء۔
عاصم، محمود (مرتب)۔ اقبال کے ملی افکار۔ لاہور: مکتبۂ عالیہ۔ ۱۹۷۷ء۔
عبدالسلام۔ افکار اقبال۔ نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۱۱ء۔
عبدالواحد معینی، سید۔ مقالات اقبال۔ لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۸۸ء۔
عشرت، وحید (مترجم)۔ تجدید فکریات اسلام۔ لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۰۲ء۔
علی، مبارک۔ تاریخ اور عورت۔ لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۶ء۔
عمر، طارق۔ "اقبال کی بے مثال نظم فاطمہ بنت عبداللہ: ایک مطالعہ" مشمولہ پیغام آشنا، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۲ء۔
عمر، طارق۔ "اقبال کی بے مثال نظم فاطمہ بنت عبداللہ: ایک مطالعہ" مشمولہ پیغام آشنا، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۲ء۔
عنبرین، بصیرہ۔ اقبال :وجود زن اور تصویر کائنات، ناشر: دار النوارد. شہر: لاہور. سن: ۲۰۱۹۔
فاروقی، عظمیٰ فرمان۔ اردو ادب میں نسائی تنقید۔ کراچی: سعید پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء۔
قریشی، نثار۔ "علامہ اقبال جدید دنیا کے تناظر میں" مشمولہ مخزن، نومبر ۲۰۰۶ء۔
قریشی، وحید۔ اساسیات اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء۔
محمد اقبال، علامہ، "جاوید نامہ" مشمولہ کلیات اقبال (فارسی)، لاہور: نقوش پریس، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۰ء۔
محمد اقبال، علامہ۔ کلیات اقبال (اردو)، لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۲۰۱۲ء۔

مسعود، خالد۔ اقبال کا تصور اجتہاد۔ راولپنڈی: مطبوعات حرمت، ۱۹۸۵ء۔
ناہید، کشور۔ عورت زبان خلق سے زبان حال تک۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء۔
نبی، شہناز۔ تانیثی تنقید۔ کولکتہ: کلکتہ یونی ورسٹی، ۲۰۰۹ء۔
ندوی، سیّد ابوالحسن علی۔ نقوش اقبال۔ کراچی: شکیل پرنٹنگ پریس، ۱۹۷۵ء۔
ہاشمی، رفیع الدین۔ اقبالیات: تفہیم و تجزیہ۔ لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۰۴ء۔
وہاب، اشرفی۔ عالمی تحریک نسائیت: مضمرات و ممکنات۔ دہلی: عفیف پرنٹرز، ۲۰۱۲ء۔
یوسف، کنیز فاطمہ۔ اقبال اور عصر مسائل۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء۔